ذکرِ حسینؑ

پروفیسر کرّار حسین

خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر، کراچی

ذکرِ حسینؑ

پروفیسر کرّار حسین

خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر
۱۲/۱۰ سی، گلبرگ، فیڈرل بی ایریا، کراچی

قیمت: ۱۵ روپے

اسد پرنٹنگ ایجنسی نے
سندھ آفسٹ پرنٹنگ پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا
تاریخِ اشاعت: ۱۲ر نومبر ۱۹۷۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنامِ آنکہ جاں را فکرت آموخت
چراغِ دل ز نورِ جاں برافروخت
(گلشنِ راز)

یہ کتاب "ذکرِ حسینؑ" دس مجالس پر مشتمل ہے۔ ان مجالس کا قیام عشرۂ ثانی ماہِ محرّم ۱۳۹۹ھ میں بمقام مرکزی امام بارگاہ لیاقت آباد عمل میں آیا۔

اس منصوبہ کی تحریک جناب سیّد علی اکبر رضوی صدر ادارۂ ترویجِ علومِ اسلامیہ کی طرف سے ہوئی اور سیّد مظفر حسین ظفَر جونپوری کا اِصرار ہوا، میں نے اِس تحریک و اِصرار کو اشارۂ غیبی سمجھا اور اس سلسلہ میں میری ہر سعیٔ فکر و عمل میرے لئے سرمایۂ سعادت اور ذریعۂ معرفت بن گئی۔

مجالس کا اہتمام اور خطبات کو ٹیپ کرنے کا انتظام سیّد علی اکبر صاحب نے کیا۔

تقریر اور تحریر کی زبان میں فرق تو ہوتا ہی ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔ سیّد سردار محمد نقوی نے بہت دیدہ ریزی اور دماغ سوزی سے ٹیپ سے حاصل شدہ مسودات کو طباعت کے لئے تیار کیا اور جب التزام یہ ہو کہ حاصل شدہ مسودات میں کم سے کم تبدیلی یا ترمیم کی جائے اور تقریر تحریر کے پردے کو اختیار

کرنے کے باوجود جوں کی توں تقریر رہے، بالذات اور بالفعل،
تو ظاہر ہے کہ ادارت کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

اِس کام میں خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر میں میرے
شریکِ کار سیّد محمّد حسن رضوی نے بر وقت ہاتھ بٹایا اور
طباعت کا کام تو حسبِ دستور تھا ہی سیّد علی نقوی صاحب
کے سپرد۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے قیامِ مجالس کا منصوبہ
پورا ہوا اسی سے دعا ہے کہ اس ذکر کو کتاب کی صورت
میں پیش کرنے کے عمل میں برکت دے اور اس کو مفید
نتائج سے بار آور کرے۔

کرار حسین

خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر
کراچی
۲ر نومبر ۱۹۷۹ء

ترتیب

پہلی مجلس

پاک ہے وہ اللہ جس نے کائنات کو خلق کیا ۔ اس کے علاوہ جتنی موجود چیزیں ہیں، جتنی موجود اشیاء ہیں سب کا خالق وہی ہے، ہستی مطلق اور واجب الوجود اسی کی ذات ہے، اس نے وجود اور عدم کو پیدا کیا، وہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا ہے، اس کے بعد اس نے ان کا تسویہ کیا، انھیں مناسب ترکیب دی، ان کے اجزاء کو مناسب ترکیب دی، پھر ان کے لئے ان کی ایک فطرت مقرر کی، ایک اندازہ مقرر کیا، ان کی تقدیر مقرر کی اس تقدیر کی طرف، اسکی فطرت کے مطابق ہر شئے کی ہدایت کرنے والا وہی ہے، اس میں خواہ جمادات ہوں یا نباتات ہوں یا حیوانات ہوں، تمام موجودات اشیاء کی فطرت کے مطابق ان کی ہدایت کرنیوالا ہے، انسان کو اُس نے خلق کی ایک اور زیادہ بلند سطح کے اوپر رکھا، جس کو قرآنی اصطلاح میں اُس نے فرمایا ہے کہ میں نے اس میں اپنی روح پھونکا، اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ ایک لطیفۂ غیبی ہے انسان میں جس کی وجہ سے وہ اپنے اللہ کی معرفت کرتا ہے، ایک لگاؤ ہے دلی طور پہ اس کو اپنے اللہ سے اور اگر یہ لطیفۂ غیبی نہ ہوتا تو انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت سے بیگانہ رہتا اور پھر اس کی حیثیت حیوانات سے بھی ارزل ہو جاتی ، اس نے اپنی روح پھونکی، اپنی معرفت کو ممکن بنایا بلکہ واجب بنایا انسان کے اوپر، اُس نے عقل دی اور عقل کے ساتھ ذمہ داری دی اور اُس نے شعور دیا بُرائی اور بھلائی، فجور اور تقویٰ کو الہام کیا لوگوں کے اوپر بے شک پاک ہے وہ اللہ اور اُس کی تسبیح کرتی ہیں تمام چیزیں کہ جو زمین و آسمانوں میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان سے ایک عہد باندھا اور وہ یہ ہے کہ اَلَستُ بربکم کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اور ہماری روحوں نے اس کا جواب دیا۔ بے شک تو ہمارا رب ہے۔ عزیز و اسی عہد کو انسان بھولتا رہا اور اسی عہد کو انسان بھولتا رہتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کی

شان ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو بھیجتا رہا تاکہ اسی بھولے ہوئے عہد کو یاد دلادے اور میں دُرود بھیجتا ہوں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر۔ —— جس نے ہمارے شعور کو بیدار کیا جس نے آنکھ کو دیکھنا اور کانوں کو سننا سکھایا اور ہمیں یہ بتایا کہ دیکھو تمہارے چاروں طرف آیاتِ الٰہی بکھری ہوئی ہیں، کانوں کو سننا سکھایا اور یہ بتایا کہ دیکھو روز و شب کی گردش کے اندر تمہارے لئے جو موعظت اور نصیحت ہے اس پر غور کرو۔ افئدہ یعنی قلب کو سمجھنا سکھایا اور یہ بتایا کہ اپنے نفس کے اندر اور اپنے اندر غور کرو تو دیکھو آیاتِ الٰہی نہ صرف چاروں طرف بلکہ تمہارے اندر بھی موجود ہیں اس پاک ذات کے اوپر دُرود ہو جس نے آنکھوں کو دیکھنا سکھایا۔ قلب یعنی افئدہ کو سمجھنا سکھایا اور جس نے اللہ کے اذن سے اور اللہ کے کلام سے انسان کی ظلمت سے نور کی طرف ہدایت کی، موت سے زندگی کی طرف ہدایت کی۔ اے مومنو! جس وقت کہ رسولؐ تمھیں پکارے، جس وقت کہ وہ دعوت دے، تاکہ تمھیں زندہ کرے تو اس کے بلانے کو تم ایسا نہ سمجھو جیسا کہ اور لوگوں کا بلانا ہوتا ہے اس کے اوپر لبیک کہو اور میں سلام بھیجتا ہوں ائمہ ہدیٰ پر۔ —— وہ کہ جنھوں نے ذکر کو قائم کیا، وہ کہ جن کی شان کلامِ پاک کے اندر یہ ہے جن کے گھر کی شان کلامِ پاک کے اندر یہ ہے کہ دنیا کے کاروبار اور دنیا کی چیزیں انھیں اللہ تعالیٰ کی یاد سے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں کرسکتیں۔ میں شہادت دیتا ہوں قد اقمت الصلوٰۃ تو نے نماز قائم کی ایتائے زکوٰۃ کا حق ادا کیا، تو نے دنیا کو خیر کی طرف بلایا، تو نے امر بالمعروف کیا، تو نے نہی عن المنکر کیا، اللہ کے اور ہمارے سلام اور اللہ کی رحمتیں ان پر ہوں۔ ائمہ ہدیٰ پر۔

رحمت ہو ان پر جو ذکر والے تھے، جو اہل الذکر تھے اور اللہ کی رحمت ہو ان کے اوپر جنھوں نے اس ذکر کو سنا اور اس کا اتباع کیا۔

عزیزانِ گرامی! یہ محفل، یہ مجلس ذکرِ حسینؑ کے لئے قائم کی گئی ہے، تو اس تمہیدی صحبت کے اندر مناسب ہے کہ اس ذکر کے تھوڑے سے آداب و شرائط کے اوپر گفتگو کی جائے، اس لئے کہ ہر بات جو کی جاتی ہے اُس کے کچھ آداب ہوتے ہیں، اس کے کچھ شرائط ہوتے ہیں اور جس وقت

کہ ان کے آداب و شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو نہ صرف وہ عمل ناقص رہ جاتا ہے بلکہ اکثر وہ نامکمل رہ جاتا ہے، اب ذکر عام طور سے جس معنی میں مستعمل ہے تو وہ اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے کسی نام سے اس کو پکارنا اور اس نام کا ورد کرنا، تم اللہ کہہ کر پکارو، رحمٰن کہہ کے پکارو، اسی کے لئے تمام کے تمام اچھے نام ہیں، اسمائے حسنیٰ ہیں اس کا ورد کرنا، عام طور سے اس کو ذکر کہا جاتا ہے اور ٹھیک ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ کہ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ قرآنی اصطلاح میں ذکر کا لفظ بڑے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے، ذرا غور کریں اور دیکھیں کہ اس لفظ کا صحیح مفہوم کیا ہے! کلامِ پاک کے اندر، قرآن کو بھی ذکر کہا گیا ہے ذکراً رسولاً محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو بھی ذکر کہا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں جو چیزیں ہیں جو حقائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق جو حقائق ہیں بشر کے متعلق، مبدا و معاد کے متعلق جو حقائق تاریخ کے اندر ہیں ان سب کو بھی ذکر کہا گیا ہے۔ قرآنِ پاک کا ایک بڑا حصہ پچھلی قوموں کے عروج و زوال سے متعلق ہے، اس کو بھی ذکر کہا گیا ہے۔ تذکرہ اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کے ذریعے سے ذکر کیا جاتا ہے اور ذکر کے معنی ہیں کسی حقیقت کو محفوظ کرنا، اپنے قلب میں محفوظ کرنا، اپنے ذہن میں محفوظ کرنا اور پھر اس حقیقت کو حاضر کرنا، اس کا استحضار کرنا اپنے قلب میں اور اپنی زبان کے اندر، اس کو بھی ذکر کہا گیا خواہ آپ اس حقیقت کو بھول چکے ہوں یا آپ اس حقیقت کو نہ بھول چکے ہوں لیکن اس حقیقت کا استحضار قلب و زبان سے ہو، اس کو ذکر کہتے ہیں تو گویا ذکر کے اندر دو معنی پنہاں ہوئے، ایک معنی تو کسی حقیقت کے متعلق ہیں، کوئی حقیقت ہے جو آپ کے ذہن میں ہے جو آپ کے قلب میں ہے جس کو آپ بھول چکے ہیں یا جس کو آپ نہیں بھول چکے، جس کو آپ یاد رکھتے ہوں اس کا استحضار، اس کو حاضر کرنا، اپنے قلب کے اوپر، اپنے دماغ کے اوپر تو پہلی بات اس حقیقت سے متعلق ہوئی اور دوسری بات جس وقت کہ اس حقیقت کو یاد رکھنے سے آپ کا شعور زندہ ہوا تو اس حقیقت کو یاد رکھنے سے موعظت، نصیحت حاصل کر کے صحیح عمل کرنا جس وقت کہ آپ کاموں کے اندر مشغول ہوں۔ اس حقیقت کو یاد رکھیں اپنی ہر بات میں اس حقیقت کو یاد رکھیں تو یہ دو باتیں ہوئیں۔ گویا ایک حقیقت جس کو حاضر کرنا اپنے دماغ کے اوپر، اپنے قلب کے اوپر، اور ایک اسی حقیقت

کی روشنی کے اندر اس حقیقت کا شعورِ بیدار حاصل کرنا اور اس کے ذریعے سے نصیحت و موعظت حاصل کرنا اسی لئے ذکر نصیحت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر ذکر کے اندر یہ دو معنی آپ کو ملیں گے، ایک حقیقت سے تعلق رکھنے والا اور ایک موعظت سے تعلق رکھنے والا، اور ان دونوں کا تعلق آپس میں یہ ہے کہ جس وقت آپ اس حقیقت کو حاضر کرتے ہیں اپنے دماغ و دل میں ہر وقت اس کو موجود رکھتے ہیں ہر وقت وہ زندہ طور پر آپ کے قلوب کے اندر، آپ کے احساس کے اندر، شعور کے اندر موجود ہو، آپ کا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ کے لئے ہو جاتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کا عمل، آپ کا کردار، آپ کا سونا جاگنا،

یہ معنی دراصل ذکر کے ہیں اور یہ منبر ذکر کا مقام ہے، یہ تذکیر ہے، تذکیر کے معنی اس ذکر کو دوسروں تک پہنچانا ہے تو گویا ذکر، تذکرہ، تذکیر ان کا مطلب ہوا کہ ایک حقیقت کو یاد کرنا، ایک حقیقت کو یاد رکھنا، اس حقیقت کو یاد رکھنے سے اس بیدار شعور سے کچھ نصیحت و موعظت حاصل کرنا اور اس کو دوسروں تک پہنچانا، اس کی اشاعت کرنا، اس کی تبلیغ کرنا، اور وہ ارسال کا کوئی طریقہ کیوں نہ ہو۔ وہ منبر ہو، وہ کتاب کے ذریعے سے ہو، کسی طریقے سے بہر حال اس کو پہنچانا، دوسروں تک کسی اقدام کے ذریعے سے وہ تذکیر ہے۔ تو عزیزانِ گرامی! اب یہ بات آپ کے سامنے واضح ہو چکی ہے کہ صحیح وارث اس منبر کا رسولؐ اور امامؑ ہوتا ہے۔ ہم اپنے لئے ایک جواز یہ پیدا کر سکتے ہیں۔ منبر پر آنے کی جرأت کا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے کہ امت میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہوں جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائیں، جو لوگوں کو معروف یعنی نیک باتوں کا حکم دیں، جو بری باتوں سے روکیں، اور حضورؐ نے ایک اور بات بھی ارشاد فرمائی۔ اسی کے ساتھ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کے اوپر زور دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں سے مت ڈرو بلکہ خدا سے ڈرو، اور آپؐ نے فرمایا کہ ہر مومن بلکہ مسلمان مرد و عورت کا ایک دوسرے کے اوپر فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کو امر بالمعروف کریں اور نہی عن المنکر کریں اور پھر آپؐ فرماتے ہیں کہ اے لوگو دیکھو اس فریضے سے غافل نہ ہو جانا، امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر کے فریضے سے غافل مت ہوجانا اس لئے کہ اگر تم غافل ہوئے تو اللہ تعالیٰ بدترینِ مخلوقِ امت کو تمھارے اوپر مسلط کرے گا اور پھر تم سعی کروگے اور وہ سعی تمھارے لئے لاحاصل ہوگی اور تم دعائیں کروگے اور وہ دعائیں تمھاری نہیں سنی جائیں گی۔

جس قوم نے یہ فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا چھوڑ دیا۔ جس جگہ حق و باطل کی تلبیس ہونے لگی جس جگہ باطل کو باطل کہنے والا کوئی نہ رہا اور حق کو حق کہنے والا کوئی نہ رہا تو اُس قوم کو تاریخ کے اندر اللہ تعالیٰ کی سرزمین کے اوپر زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔

یہاں ضمناً میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ ان قوموں کے اندر بھی جن کے اندر ظاہرہ طور پر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ بہت ساری برائیاں ہیں۔ تم دیکھو گے کہ برائی کو... برا کہنے والے، اس برائی کی نشاندہی کرنے والے بھی اسی قوم کے آدمی ہیں اور یہی ان قوموں کی SURVIVAL کا یہی ان قوموں کی بقا کا راز ہے کہ وہ لوگ موجود ہیں کہ جو اچھائی کو اچھائی کہتے ہیں اور برائی کو برائی کہتے ہیں۔ جن چیزوں کے اوپر تم فخر سے یہ کہتے ہو کہ ہماری قوم کے اندر یہ برائیاں نہیں ہیں، فلاں قوم کے اندر یہ برائیاں ہیں۔ یہ بات بھی اسی قوم والوں نے تمھیں سکھائی ہے ورنہ تمھاری سمجھ میں نہیں آتی، یہ وہی تو بتانے والے ہیں کہ ہماری قوم کے اندر یہ برائی ہے تو جس قوم کے اندر حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے والے نہیں رہتے، جس قوم کے اندر حق کو باطل کے ساتھ اشتباہ کیا جاتا ہے جس قوم کے اندر وہ نظر نہیں رہتی جو حق اور باطل میں تمیز کرسکے اور جرأت نہیں، جو حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ سکے اس لئے کہ اس کے اندر دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ آپ سمجھیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا دوسرے یہ کہ آپ کے اندر جرأت ہو کہنے کی اس لئے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ذرا ہمت طلب ہوتا ہے جس قوم کے اندر یہ ہمت نہ رہی، جس قوم کے اندر یہ جرأت نہ رہی تو وہ قوم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے حساب کے لحاظ سے اپنے زندہ رہنے کا حق کھو بیٹھتی ہے۔

عزیزو! حضورؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو دیکھو اس وظیفے سے غافل مت ہونا اپنا اپنا جو تمھارا مرتبہ ہے، وہ الگ ہے، رسولؐ کا اپنا مرتبہ ہے۔

امام کا اپنا مرتبہ ہے، ایک مومن کا اپنا مرتبہ ہے، لیکن جو تمھارا مرتبہ ہے، جو تمھارا مقام ہے اس کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرنا کہ حق کون سا ہے اس لئے کہ یہ بات نہیں ہوتی کہ حق و باطل کو آسانی سے شناخت کر لیا جائے اس کے لئے تو نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ نگاہ آسانی سے نہیں پیدا ہوتی ۔ عزیزانِ گرامی! بڑی بات امام کے وجودِ بابرکت کی رسولؐ کے وجودِ بابرکت کی یہ ہے کہ حق حق ہو جاتا ہے اور باطل باطل ہو جاتا ہے۔ .. .. ورنہ انسان کا نفس تو خود کو دھوکا دینے والا ہے اور انسان کو شیطان اس طرح بہکاتا ہے کہ ان چیزوں کا کہ جو بیّن طور پر باطل ہوں ان کے جواز کے فتوے بھی تراشنے شروع کر دیتا ہے اور تمام کی تمام اسلام کی تاریخ ایسے فتوؤں سے بھری ہوئی ہے ۔ بڑی بات جو تھی یزید کو یزید بنانے والی امام حسین علیہ السّلام کی ذاتِ بابرکت تھی کہ جس نے یزید کو فاش کر دیا، اب اگر کوئی ذات ایسی ہے تو وہ یہ بتائے کہ کون کون سے یزید کس بھیس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ یزید سامنے نہیں ہوا کرتے، ماتھے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ وہ یزید ہے۔ تو یہ کم و بیش اپنے اپنے رتبے کے اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوت الی الخیر تو حضورؐ نے فرمایا کہ لوگو یہ تمھارا فریضہ ہے اسی سے ذرا جواز پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک آدمی جو کچھ بھی دیانتداری کے ساتھ خیر سمجھتا ہے یا معروف سمجھتا ہے یا منکر سمجھتا ہے تو وہ اپنے بھائیوں تک پہنچا دے اس سے آگے اور کوئی دعویٰ نہیں ہوتا اس لئے کہ جیسے میں نے آپ سے عرض کیا ہے صاحبِ منبر وارثِ منبر محمد مصطفےٰؐ اور ائمہ اطہارؑ کی ذات ہے جنھوں نے منبر پر ذکر کو قائم کیا پھر اس کے بعد عزیزو! .. .. اس منبر کی روایت جب آگے چلی تو اس میں تاریخ اسلام کا وہ ایک بڑا زبردست واقعہ آیا جس کو واقعۂ کربلا کہا جاتا ہے جس کا ذکر ہم منا رہے ہیں، جس کی یاد ہم منا رہے ہیں، یہ موقع نہیں ہے کہ اس واقعے کی اہمیت میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ انشاء اللہ وہ بھی اپنی کسی تقریر میں پیش کروں گا بس اس کو اس طریقے سے سمجھ لیں۔ مختصر طور کے اوپر اور وہ یہ ہے کہ حق کی اشاعت کے اندر دو رکاوٹیں سامنے آتی ہیں، ایک کا نام ہے کفر اور ایک کا نام نفاق، کفر وہ دشمن ہے

جو کہ کھلم کھلا حملہ کرتا ہے حق کے اوپر اور اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔۔

۔۔ ۔۔ ۔۔۔ایک بات اس میں اور میں آپ سے عرض کروں، کفر انکار کرنے کو کہتے ہیں، انکار اس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز پیش کی جاتی ہے۔ عرب کے لوگ کہ حق تک ہدایت نہیں آئی تھی تو ان کو کلام پاک میں اس وقت کافر نہیں کہا گیا ان کو مشرک کہا گیا، کافر تو اس وقت ہوئے جب اُن کے سامنے حق پیش کیا گیا اور انھوں نے انکار کیا۔ جب انھوں نے حق کے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں اس وقت وہ کافر ہوئے۔ بیّن آیات لے کے اللہ کا رسولؐ آیا اور اس کا انکار کیا، اپنی ہٹ دھرمی سے انکار کیا اس وقت وہ کافر ہوئے تو ایک مقابلہ حق کا ہوتا ہے کفر کے خلاف اور اس مقابلہ اور تصادم کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں ، اس کی صورتیں ایسے ہوتی ہیں کہ حقیقت جو ہوتی ہے اس کی اشاعت کی جارہی ہے، اس کی تردید کی جارہی ہے۔ محمدؐ مصطفےٰ کی ذات ایک چمکتے ہوئے سورج کی مانند ہے، ایک روشن سورج کی طرح سے ہے اس سے ہر شخص اپنے ظرف اور اپنے فہم کے مطابق فیض حاصل کرتا ہے یہ بات کہ محمدؐ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو، تعلیم ہے اس کی تہ تک پہنچا۔ یہ بہت کم خوش نصیب آدمیوں کا کام ہے، اس کے لئے بہت بڑے ظرف کی ضرورت ہے۔ میں عرض کروں کہ اس کے لئے تو کوئی کہنے والا جب تک یہ نہ کہے کہ میں نے اس طرح سے علم حاصل کیا ہے کہ جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلے تو اس سے بہتر کوئی تمثیل نہیں ہوسکتی علم حاصل کرنے کی اس لئے کہ وہ اونٹنی کا بچہ کبھی بڑا ہو کر اونٹ ہوتا ہے بالکل اس اونٹنی کے برابر ہی ہوتا ہے تو یہ مرتبہ جو ہوتا ہے یہ تو بہت بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ ویسے ہر آدمی اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیض حاصل کرتا ہے اور حقیقت کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں، ان مختلف پہلوؤں کے اندر رشتہ قائم کرنا ان کو سمجھنا ایک اکائی کی طرح ان کو سمجھنا ایک انتہائی متحدہ چیز کے طور پر ان کو سمجھنا یہ بہت بڑے ظرف کا کام ہے، یہ اس کے لئے بلکہ میں یہ کہوں کہ یہ ان ہی لوگوں کا کام ہے کہ جن کو مخصوص ظرف اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ اب اپنے اپنے طور کے اوپر تاویل ہونی شروع ہوتی ہے، اپنے اپنے طور کے اوپر اس کی

تفسیر ہونی شروع ہوتی ہے ، کچھ زمانے کے حالات شروع ہوتے ہیں ، کچھ جس وقت کہ ایک انقلاب میں داخل ہوتا ہے جب حکومت حاصل ہو جاتی ہے ، اس وقت منافقوں کی ایک یلغار ہو جاتی ہے اس لئے کہ اب حملہ باہر سے تو ہو نہیں سکتا ، اب تو جو کچھ بھی ہوگا وہ اسی حصار کے اندر داخل ہو کے ہوگا تو اس وقت وہی کفر ہوتا ہے کہ جو اسلام کی نقاب پہن کے ، حصار اسلام میں داخل ہو جاتا ہے ۔ گویا نفاق کی تعریف یہ ہے کہ یہ نفاق فطرتاً و عادتاً کفر ہوتا ہے مگر اس کا لباس بدلا ہوتا ہے ، کفر کھلم کھلا کفر ہوتا ہے اور نفاق کے چہرے کے اوپر پردہ پڑا ہوتا ہے ، محض یہ فرق ہوتا ہے کبھی یہ ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت حکومت مل جاتی ہے تو یہ دولت اور یہ اقتدار اور یہ طاقت خود شیطان کے بہت بڑے حربے ہیں اور لوگوں کی ذہنیتیں بدلتی چلی جاتی ہیں ، اس کے کہنے کا ابھی وقت نہیں ہے کہ وہ کس طرح سے ذہنیتیں بدلتی ہیں اور اس انقلاب کے مقابلے میں ردِّ انقلاب پیدا ہوتا ہے ، نفاق کی بہت ساری صورتیں ہوتی ہیں تو دین کے مدِمقابل دو چیزیں ہوئیں ، ایک کفر اور دوسرے نفاق ۔ اس ضمن میں اور بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں تو نفاق کہلاتی ہیں یہ دو مقابلے ہوئے ، ان میں محض ایک فقرہ کہہ کر پھر میں اپنے مضمون کو آگے بڑھاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ایک میدان کو اپنے سامنے رکھو ، میدانِ بدر اور میدانِ کربلا اپنے سامنے رکھو ۔ میدانِ بدر کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ۳۱۳ ساتھیوں کو لے کر تشریف لائے تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے ایک دعا کی ایک ناز کی دعا کی اسکے اندر ایک عبد کا ناز تھا اپنے آقا کے اوپر ، اور آپ نے فرمایا کہ اے اللہ اگر یہ قلیل جماعت آج ختم ہو جاتی ہے تو تیرا نام لینے والا اس زمین کے اوپر نہیں رہے گا ۔ آپ یہ دیکھیں کہ یہ ایک دعویٰ ہے ، ایک ناز ہے ایک عبد کا ناز ہے اپنے آقا کے اوپر ، میں یہ عرض کرتا ہوں کہ کیا امام حسین علیہ السلام یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے ، میدانِ کربلا کے اندر کہ یا اللہ یہ بہتر آدمی ہیں جن کو میں لے کر آیا ہوں ان کی شہادت کو آج قبول کر لینا ورنہ تیرے اسلام کی ہیئت بگڑ جائے گی ، اسلام کی قدریں بگڑ جائیں گی ، اسلام پہچانا نہ جائے گا ۔ اسلام خدا

پرستی کا دین نہیں بلکہ شاہ پرستی کا دین بن جائے گا تو وہ کفر کا مقابلہ تھا اور یہ نفاق کا مقابلہ ہے۔ اگر یہ شہادت قبول نہیں ہوتی تو پھر اسلام اسلام نہیں رہے گا نام اس کا ضرور رہے گا مگر ہیئت وصورت جو ہے تو وہ بدل جائے گی۔ تو عزیزو! یہ اہمیت واقعۂ کربلا کی ہماری تاریخ کے اندر دین کی تاریخ کے اندر ہے، اس کا ذکر بھی تو قائم کرنا تھا، اور اس کا ذکر قائم ہوا جناب سیدِ سجادؑ کے ذریعہ سے اس کا ذکر قائم ہوا جناب زینبؑ کے ذریعے سے، یہ ذکر جو تھا اب ذکر کی روایت کے اندر ایک اور اضافہ ہوا یعنی امام حسین علیہ السلام کا تذکرہ اس کو یاد کرنا وہ اب شامل ہوا اب ہمارے ذکر کی جو روایت تھی اس کے اندر وہ بات بھی آگئی کہ کفر سے کیسے مقابلہ کیا جاتا ہے اور یہ بات بھی آگئی کہ نفاق سے کس طریقے سے مقابلہ کیا جاتا ہے، وہ ہدایت جو ہے وہ ہم تک پہنچی اور بے شک ذکرِ حسینؑ کرنے کا حق ان کی بہن کو ہے اور ان کے بیٹے کو ہے، بے شک شام میں جس انداز سے ذکر ہوا اور مدینے پہنچ کر جو جناب سیدِ سجادؑ نے ذکر کیا وہ تاریخ کے اندر ثبت ہے، ہاں ہم لوگوں کو جو اُن کے غلام ہیں ہمیں بھی ایک اجازت ہے اور وہ امام نے یہ بات فرمائی لوگوں سے کہ تم ذکرِ حسینؑ کرو اور اس مجلس کے اندر خود امام شریک ہوئے، اس مجلس کے اندر اہلبیتؑ پردے کے پیچھے بیٹھ کر اس ذکر کو سنتے تھے۔

عزیزانِ گرامی! اس روایت کو آگے لے چل رہے ہیں جو محمد مصطفیٰؐ کے مبارک ہاتھوں سے بنی اور جن کے اندر اضافہ کیا گیا ائمہؑ کے ذریعے سے اور جناب سیدہ زینبؑ کے ذریعے سے اس روایت کو ہم بیان کر رہے ہیں اور اس کے ذریعے گویا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے کلام کو پھیلا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کو پھیلا رہے ہیں اور حسب توفیق ہم محمد مصطفیٰؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اذن سے۔ اذنِ جنابِ سیدہؑ اور اذنِ جنابِ سیدہ زینبؑ اور اذنِ جنابِ ائمہؑ سے ہم اس روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

اب جس وقت کہ یہ مقام ہمارے سامنے واضح ہو گیا اس منبر کا تو اب اس کے آداب بھی معلوم ہو گئے اور اس کے آداب کے متعلق ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس کے آداب کے متعلق یہ ہے کہ تم دین کی طرف لوگوں کو بلاؤ، اسلام کی طرف لوگوں کو بلاؤ، یہ بتاؤ کہ کفر

کس طرح حملہ کرتا ہے، یہ بتاؤ کہ نفاق کس طرح سے حملے کرتا ہے اور اس منبر کے اوپر بیٹھ کر اس بات کو اپنے ذہن میں رکھو کہ تم کسی کے سامنے جواب دہ ہو ہر کلمے کے لئے جو تمھارے منہ سے نکلتا ہے، اس لئے کہ وہ پاک کلمہ ہی ہے جو اللہ کی طرف صعود کرتا ہے۔ جو جھوٹے کلمے ہیں وہ یہیں رہ جاتے ہیں اور اس بات کو سمجھ کے اس کے اوپر بیٹھنا ہے کہ ہم عبادت کے اندر شریک ہو رہے ہیں تو عزیزانِ گرامی! عبادت میں اور تجارت میں بہت فرق ہوا کرتا ہے اور یہ فرق کسی مجلس میں تفصیلاً عرض کروں گا، اللہ تعالیٰ نے یہود کے زوال کی جو وجوہات بتائی ہیں تو اس میں یہ بات بتائی کہ ان کے علما، اللہ تعالیٰ کی آیات کو تھوڑے منافع کے لئے بیچ دیا کرتے تھے اور یہ تھوڑا منافع لے کر آیاتِ الٰہی کو بیچنا بڑا بلیغ فقرہ ہے جس کی میں یہاں زیادہ توضیح نہیں کروں گا۔ بہرحال ہر صورت میں عبادت اور تجارت کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا ہے اور لوگوں کو خیر کی طرف بلانا ہے اور اس امتِ محمدیؐ کی وحدت کو قائم کرنا ہے اور اس بات کو اپنے ذہن میں رکھنا ہے کہ امتِ محمدیؐ کی وحدت کے لئے کس کس نے کیا کیا قربانیاں دی ہیں اور اس سلسلے میں محض ایک فقرہ اور وہ فقرہ یہ ہے کہ عزیزو ائمہ اہلبیتؑ اللہ کی رحمتیں ان کے اوپر ہوں، اللہ کے فرشتوں کے درود و سلام ان کے اوپر ہوں۔
وہ عامۃ المسلمین کے خلاف نہیں تھے وہ مسلمانوں کے امام تھے، امام ماموم کا دشمن نہیں ہوا کرتا، جس کی رہنمائی کرنے کے لئے وہ مامور ہے جس کی ہدایت کرنے کے لئے وہ مامور ہو تو وہ اس سے دشمنی یا اختلاف نہیں پیدا کرے گا۔ عزیزو! ان کا اختلاف جو تھا وہ عامۃ المسلمین سے نہیں تھا وہ ان ظالم و جابر لوگوں سے تھا کہ جو اسلام کو مسخ کر رہے تھے جو لوگوں کے اوپر ظلم کر رہے تھے، ان کے مقابلے پر ظالم و جابر حکمران تھے۔ عامۃ المسلمین ائمہؑ کے مقابلے پر نہیں تھے، اور یہی دعوت الی الخیر ہے کہ وحدتِ امت کو۔۔۔۔۔۔
قائم رکھو اور امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو اور اس منبر کے اوپر بیٹھ کر یہ مت سوچو کہ سننے والے جو ہیں ان کی طبیعت خوش ہو گی یا نہیں ہو گی، یہ بات مت کرو کہ تمھارا یہاں مجلس کر لینا تمھارے لئے بہت کافی ہے اور تم جو کچھ بھی کئے جاؤ گے اگر تم نے سال میں تھوڑے سے پیسے اس کے اوپر خرچ کر دیئے اور بہرحال شفاعت جنابِ سیدہؑ فرمائیں گی۔

اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں گے یہ بات جو ہے مت کرو، یہ باتیں مت کرو
کہ یہاں آنے کے بعد تمہیں عبادت کی کوئی ضرورت نہیں رہی، پہلے دوسری عبادتیں جو ہیں
وہ تمہارے کریڈٹ اکاؤنٹ کے اندر ہوں تو پھر تم شفاعت کے متعلق سوچو۔
اگر ہمت وجرأت ہو تو کچھ ائمہ کی حدیثیں بتاؤ، یہ تو بتاؤ کہ جو ان کے شیعہ ہونے کا
دعویٰ لے کے جاتے تھے تو وہ کیا کہتے تھے، کیا ائمہ اطہارؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمارے
شیعوں کی نشانیاں ہیں، بغیر ان نشانیوں کے شیعہ ہونے کا دعویٰ مت کرو۔ ایسی باتیں مت
بتاؤ کہ ایک قوم جو پہلے ہی غفلت کے اندر ہے اس کو اور تم غفلت کے اندر سلادو۔
تو واسطے کہ اس منبر کے اوپر بیٹھ کر کم از کم قلیل ترین جو بات ہے وہ یہ ہے کہ انسان یہ
تو دعا مانگے کہ میرا مولیٰ مجھ سے خوش ہو، میرا مولیٰ مجھ سے خوش ہو اور یہ جو لوگ سننے
والے ہیں یہ بھی اسی محبت کے مارے آئے ہیں، اس سے کم از کم میرا فرض یہ ہے کہ میں
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو کر لوں۔ عزیزانِ گرامی ایک بات مجھے یاد آتی ہے اور
وہ بات جس وقت یاد آتی ہے تو وہ بڑی لرزا دینے والی بات ہے اور وہ لرزا دینے والی
بات جو ہے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا، اور اس خواب
میں کچھ ایسی بات تھی جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑے پریشان
تھے اور ظاہر ہے کہ یہ رویا رصادقہ ایک پیغمبرؐ کا خواب ہے جس وقت کہ آپ سے اس پریشانی
کی وجہ پوچھی تو آپؐ نے کہا کہ میں کیا بتاؤں کہ میں نے یہ دیکھا کہ میرے منبر کے اوپر بندر
اچھل رہے ہیں اور اس بندر کے لفظ کو اگر آپ دیکھیں اس کے مطلب کو آپ دیکھیں
تو یہ مسخ شدہ ہونے کی علامت ہے جو کہ کلامِ پاک کے اندر ہے اور یہ نقل کی علامت ہے۔
جس طرح کہ دجال جو ہے وہ امام کی یا رسولؐ کی نقل کرے گا اور شیطان اللہ کی نقل کرتا
ہے، اللہ کہتا ہے کہ میں قدرت رکھتا ہوں اور میں نعمتیں دیتا ہوں اور دجال بھی وہ
تمام معجزے دکھائے گا جو کہ پیغمبر اور امام دکھایا کرتے ہیں تو بندر کی اصطلاح اس
Sense کے اندر آتی ہے، اب اس بات پہ اگر غور کرو تو اس کا مطلب محض
بنی امیہ کے منبر کے اوپر بیٹھنے سے نہیں ہوتا اس لئے کہ رسالت کا منبر جو ہے وہ تخت و

حکومت ہی نہیں ہے وہ کچھ اور بھی ہوتا ہے اور اس بات کا ہمیں خیال رکھنا ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں WARN کیا ہے ہمیں خبردار کیا ہے، ہمیں آگاہ کیا ہے، ایک بات خاص طور سے ذہن میں رکھنا ہے کہ یہ منبر ہے۔ اس منبر سے جہاں سے حرفِ حق بیان کیا جاتا ہے، اس منبر کے نزدیک جیل خانہ بھی ہے، شہادت گاہ بھی ہے، وہ جو نظیری نے ایک شعر میں لکھا ہے کہ "نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی" کہ میرے جنگل کے خشک و تر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ "چوب ہر نخل کہ منبر نہ شود دار کنم"۔ جس درخت سے منبر نہیں بنتا ہیں اس سے دار بنا لیتا ہوں تو یہ دار کی منزل بہت نزدیک ہے اس منبر کے اس لئے کہ حرفِ حق بیان کرنا ہے اور تمھیں معلوم ہے کہ اسی منبر سے کیا حرفِ حق بیان کیا گیا ہے اور کس طرح سے تذکیر کی گئی ہے اور اس کے کیا کیا نتیجے ہوئے ہیں۔

عزیزانِ گرامی! جیل خانے میں جانا اور قتل گاہ کے اندر جانا اور مقتل میں جانا وہ راستہ اسی منبر سے جاتا تھا وہ آزمائش اور قربانی کا راستہ، اسی تذکیر سے جاتا تھا اسلئے کہ اور کوئی جھگڑا نہیں تھا، جھگڑا تو اسی بات کا تھا کہ منبر کے اوپر بیٹھ کر جو تذکیر کی جاتی تھی تو حرفِ حق بیان کیا جاتا تھا، حق کو حق کہا جاتا تھا باطل کو باطل کہا جاتا تھا اور یہ بات کہی جاتی تھی کہ غیر حق کے سامنے ہمارا سر جھکنے والا نہیں ہے تو اس منبر کا مقام جو ہے تو وہ مقتل سے یا دار سے بہت قریب ہوتا ہے بہت نزدیک ہوتا ہے، یہ ان لوگوں کا شرف اور ان لوگوں کی عزت ہے کہ جن کے اندر وہ نظر اور جرأت ہوتی ہے۔

عزیزانِ گرامی! اب آپ یہ دیکھیں کہ ذکر ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے ہوتا ہے، کلامِ پاک میں ذکر کے متعلق کہا گیا ہے کہ دیکھو لوگو تم لوگ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کروٹ لیتے ہوئے اللہ کو یاد کرو، چاروں طرف دیکھتے رہو، یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں پھر تم یہ غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو باطل نہیں پیدا کیا ہے اور تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو فتح کے موقع پر بھی جب اللہ تعالیٰ نے تمھیں حکومت دی ہے تو تم یاد رکھو، اس ضمن میں آپ کو وہ واقعہ بھی یاد ہے جو تاریخ

کے اندر سنہری الفاظ سے ثبت ہے، اور وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ فتح کرنے کے بعد، اپنے غنیموں کے اوپر فتح پانے کے بعد جس طریقے سے مکہ میں داخل ہوئے ہیں تو اس وقت کیا کیفیت تھی اس وقت بھی اللہ کو یاد کر رہے تھے، یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ کون میرا دشمن تھا اور کس سے مجھے انتقام لینا ہے اور عزیزو انتقام کے وقت جبوقت کہ تم انتقام لے سکتے ہو تو اس وقت اللہ کو یاد رکھو۔ تمھیں یاد ہے کہ جناب امیر المومنین علیہ السّلام، یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں مگر تم دیکھو کہ کتنے روشن واقعات ہیں کہ جناب امیر المومنین کا قاتل جو ہے وہ دروازے کے اوپر مشکیں بندھے ہوئے موجود ہے و وہ انتقام کہ جو انتقام جائز تھا وہ آپ کے اختیار میں تھا لیکن جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ اس کی مشکیں تو کھولو۔ تم اس کی مشکیں کھولو یہ ہمارے یہاں مہمان ہے، یہ شربت جو ہے یہ اس کو بھی تو دیدو۔ انتقام کے وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا یہ ایمان کی پہچان ہے معاویہ جو ہے تو وہ جنگِ صفین میں نہر کے اوپر قبضہ کر لیتا ہے پانی بند کر دیتا ہے جناب امیرؑ کے لشکر پر پانی بند کر دیتا ہے، جناب امیر المومنین ایک حملے کے اندر اس کی فوج کو ہٹاتے ہیں اب نہر کے اوپر قبضہ جناب امیر المومنین علیہ السلام کے لشکر کا ہو گیا ہے۔
اب معاویہ کے لشکر کے اندر ایک کھلبلی پیدا ہوتی ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ کیا جنگ کی جائے گی اس نہر کو دوبارہ لینے کے لئے یہ تو پانی بند کر لیں گے اس لئے کہ ہم نے ان کے ساتھ یہی کیا تھا اور کلامِ پاک کے اندر ہے کہ اگر کوئی تمھارے اوپر زیادتی کرتا ہے تو تم حد سے مت گزرو لیکن جس حد تک زیادتی اس نے کی ہے اس حد تک زیادتی کرنے کا جواز ہے، معاویہ کے لشکر میں عمرِ عاص جیسے لوگ بھی موجود تھے انھوں نے کہا کہ معاویہ اپنے اور حضرت امیر المومنین علیؑ کے اندر فرق ابھی تک نہیں سمجھا ہے تجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ تو نے پانی بند کیا تھا لیکن علیؑ پانی بند کرنے والے نہیں ہیں چنانچہ جب ان کے پاس درخواست گئی تو آپ نے فرمایا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کے لئے حلال قرار دیا ہے تمام مخلوق کے لئے اس کو بھیجا ہے تو میں اس کے لئے پہرے بٹھانے والا کون ہوں۔
عزیزو! یہ وہی فرات کا کنارہ ہے یہ وہی فرات کا پانی ہے تو اس کو یاد رکھنا اور ظالم و

جابر جس وقت کہ بادشاہ ہو تو اس کے سامنے یاد رکھنا اور یہ بات یاد رکھنا کہ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے، عزت اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہے، اور جو کوئی بھی اسے غصب کئے ہوئے ہے اس کو بتانا ہے کلمۂ حق کا اس کے سامنے اعلان کرنا ہے، تو یاد کرنا اللہ تعالیٰ کو اس وقت کہ جس وقت تمھارے سامنے دنیا کی رلیچ ہو ایک طرف سے لالچ تمھیں کھینچ رہی ہو، ایک طرف سے خوف تمھارے اوپر دباؤ ڈال رہا ہو، اس لالچ و خوف کے بیچ میں اللہ کو یاد رکھنا اور ظالم و جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا یہ ذکر ہے، اور ذکر یہ ہے کہ جس وقت تمھاری آزمائش ہو مصیبتوں کے اندر اور سختیوں کے اندر اور جس وقت نقصِ اموال ہو، نقصِ ثمرات ہو، جس وقت کہ اللہ تعالیٰ کے راستے کے اندر تمھاری اولاد کی جانیں جارہی ہوں جس وقت کہ تمام کا تمام گھر لٹ رہا ہو اس وقت اور زیادہ استقامت کے ساتھ اپنے قدم کو مضبوط رکھو کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں یہ ذکر کی شان ہے کہ زندگی کے تمام نشیب و فراز کے اندر وہ سختی کا ہو یا خوش حالی کا ہو، وہ دنیا کے سامنے ہو یا کسی سلطانِ جابر کے سامنے ہو کلمۂ حق بیان کرنا اور اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا یہ ذکر ہوتا ہے اور عزیزانِ گرامی میں آپ سے کیا عرض کروں امام حسینؑ نے کیا کیا تذکیر کا حق ادا نہ کیا، اسی میدان کے اندر کون کون سی باتیں تھیں کہ جو یاد نہ دلائیں کربلا کے میدان میں امام حسین علیہ السلام نے کیا، امام حسینؑ نے یہ یاد نہیں دلایا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ کیا یہ نہیں بتایا کہ یہ حق سمٹتا چلا جارہا ہے، باطل پھیلتا چلا جارہا ہے، یہ تمھارے اوپر ظلم ہو رہا ہے، یہ تمھارے اوپر جور ہو رہا ہے، اے اندھے طاقت کے پرستارو، اے دولت کے لالچیو یہ دنیا تمھارا ساتھ دینے والی نہیں ہے، یہ طاقت چلنے والی نہیں ہے۔ کیا امام حسین علیہ السلام نے اس کا اعادہ نہیں کیا کہ تم نے مجھے ہدایت کے لئے طلب کیا تھا، تمھارے تو خط میرے پاس پہنچے تھے، میں امام ہوں، میرے اوپر فرض ہے کہ جس وقت کوئی ہدایت کے لیے مجھے بلائے تو میں آؤں، کیا کوئی یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام اچھی طرح سے ان کی فطرت سے آشنا نہیں تھے، کیا اس بات کو نہیں جانتے کہ جب امام حسین علیہ السلام مکہ سے روانہ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنی وعدہ گاہ کی طرف جارہا ہوں، کیا یہ حقیقت نہیں ہے،

کہ امام حسین علیہ السّلام نے یہ فرمایا کہ میرے لئے تو کوئی جائے پناہ ہی نہیں ہے۔ میں تو اگر جانوروں کے بھٹ میں جاکر پناہ لوں تو یہ لوگ وہاں سے مجھے نکال لیں گے، مگر یہ یاد دلاؤں کہ دیکھو تم نے ہدایت کے لئے بلایا، میں نے یہاں آکے اپنی حجت پوری کرلی، اب تم کیسی حجت پوری کر رہے ہو، تم اس کا کیا جواب دو گے، اور آخر وقت تک کیا امام حسین علیہ السّلام نے یہ بات نہیں فرمائی کہ لوگو تم میں سے بہت سارے وہ ہیں جنھوں نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے جدِ امجد کا زمانہ دیکھا، تم ذرا آکے گواہی دو تم نے کیا دیکھا ہے، تم نے میرے جدِ امجد کو مجھ سے کیسے پیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیسی میری قدر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

عزیزانِ گرامی! یہ تو تمام کی تمام تذکیر کی منزلیں تھیں اور ذکرِ حسینؑ، ذکرِ حسینؑ کے لئے میں آپ سے کیا عرض کروں، کیا یہ کہوں کہ وہ ایک رات کی عبادت تمام عبادتوں پر بھاری ہے یا میں یہ کہوں کہ وہ خنجر کے نیچے جو سجدہ کیا تھا وہ تمام عبادتوں سے بھاری ہے، اور اس رات کے ذکر کے متعلق میں کیا کہوں خاص طور پر ایک رات کی مہلت لی جارہی ہے، یہ ایک رات کی مہلت کس لئے؟ فوج کی تیاری کے لئے نہیں بلکہ عبادت کرنے کے لئے، ذکر کرنے کے لئے۔

عزیزانِ گرامی! وہ ذکر کی منزل تھی کہ جہاں راز و نیاز کی باتیں ہورہی تھیں، اس بات کو سوچو کہ جہاں لشکرِ اعدا چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے امام حسین علیہ السّلام کے چند ساتھی ہیں، امام حسین علیہ السلام آزمائش کے طور پر نہیں بلکہ اس حقیقت کو عالم آشکار کرنے کے لئے کہ ہاں یہ وہ لوگ ہیں جو اس شہادت کے شرف میں میرے شریک ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں، وہ ان سے یہ بات کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بیعت کا قلادہ تمھاری گردنوں سے ہٹا لیا اب تم رات کے اندھیرے میں یہاں سے چلے جاؤ اور تمھارے ساتھ میرے عزیزوں میں بھی جو جانا چاہیں چلے جائیں، اس کا ایک پہلو عرض کروں کہ امام حسین علیہ السّلام ایک مقصد سے نکلے تھے، عزیزانِ گرامی! یہ اس مقصد کے اندر یقین تھا کہ اب یقین کی وہ منزل آگئی ہے کہ میری قربانی سے مقصد پورا ہو جائے گا، اب جو کوئی شریک ہوتا ہے یہ اس کی

سعادت ہے اور جو کوئی میرا شریک نہیں ہونا چاہتا تو میری بیعت سے علیحدہ ہے اور وہ بڑے شوق سے جا سکتا ہے یہ وہ یقین کی منزل تھی، کون بندہ اس کا تصور کر سکتا ہے کہ آسمان سے کیا باتیں نازل ہو رہی تھیں اور زمین سے آسمان کی طرف کیا باتیں جا رہی تھیں! مَا یَنزِلُ وَمَا یَعرج یہ دو صورتیں جو تھیں کہ حسینؑ کی طرف سے کیا بات جا رہی تھی اور اللہ کی طرف سے کیا بات نازل ہو رہی تھی اس کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے یا شاید حسینؑ کو کچھ یاد آ گیا ہو اس لئے کہ انھوں نے دعا مانگی تھی یا اللہ اکثر ایسے موقعے آئے ہیں کہ میں بے چارہ اور بالکل بے کس ہو گیا، تو اس وقت میں نے تیری طرف رجوع کیا، اب بھی میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں تو وہ راز و نیاز کی ایک گفتگو تھی حسینؑ نے کہا ہو گا یا اللہ یہ موقع ہے، یہ امتحان ہے، اگر تو نے اس امتحان میں مبتلا کیا ہے تو پھر مجھے ثابت قدم رکھنا، استقامت دینا۔ حسینؑ نے یہ کہا ہو اور اللہ نے پشت پر ہاتھ رکھا ہو اور قلب پر ہاتھ رکھا ہو گا اور اس وقت کہا ہو گا کہ ہاں حسینؑ تو تو خود کہہ چکا ہے کہ اسلام کی بقا اگر اسی بات کے اندر ہے کہ میری گردن چلی جائے تو میری گردن حاضر ہے۔ کدھر ہیں وہ تلواریں وہ آکے میری گردن کو قطع کر لیں، اور ایک وعدہ اللہ تعالیٰ نے اور کیا ہو گا اور وہ یہ کہ حسینؑ میرا ذکر تو نے قائم کیا اور میری سنت جو ہے وہ یہ ہے کہ تیرا ذکر میں قائم کروں گا، رفعنا لك ذكرك میں تیرے ذکر کو بلند کروں گا، اللہ تعالیٰ نے کہا ہے تم میرا ذکر کرو میں تمھارا ذکر کروں گا۔ تو حسینؑ نے ذکر کیا اللہ تعالیٰ کا اور اللہ تعالیٰ نے حسینؑ کے ذکر کو بلند کیا مگر میں حیران ہوتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے کون سے طریقے ہیں، اس کی رحمتوں کے کیا کیا طریقے ہیں، میں صرف ایک بات پوچھتا ہوں کہ اے میرے رب کیا حسینؑ کے ذکر کو بلند کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ جو بازاروں کے اندر اونٹوں کے اوپر نظر آتا ہے، جو درباروں میں نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے عزیزو حقیقت یہ ہے کہ وہ کافر، وہ منافقین، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم ذلیل کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر اپنے وعدے کو پورا کر رہا ہے کہ تم میرا ذکر کرو اور میں تمھارے ذکر کو بلند کروں گا۔ خدا اس ذکر کو قیامت تک بلند رکھے، خدا ہمیں توفیق دے کہ اس ذکر کو بلند رکھیں۔

دوسری مجلس

تمام حمد اس اللہ کو سزاوار ہے جس کی طرف اس کا بندہ اپنی حاجتوں میں، اپنی سختیوں میں، اپنی تنہائیوں میں اس وقت رجوع کرتا ہے جب چاروں طرف اس کے مایوسی چھا جاتی ہے اور جس وقت اس کے تمام اسباب اور تمام ذرائع منقطع ہو جاتے ہیں یہی اللہ کے معنی ہیں اور وہی عبادت کے قابل ہے جو ہمارا رفیقِ اعلیٰ ہے جو ہماری حاجتوں کو پورا کرنیوالا ہے جو عُسر میں سے یُسر نکالنے والا ہے، سختیوں میں آسانی پیدا کرنے والا ہے، ہماری تنہائیوں میں ہمارا رفیق ہے جس وقت ہم پکاریں تو ہمارا جواب دینے والا ہے، اور وہ تو جس نے تمام کائنات کو پیدا کیا اور ہر شئے کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جاتا ہے اور ہر حال کے مطابق اسکو رزق مہیا کرتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے جو رب العالمین ہے جس کی رحمانیت کی یہ شان ہے کہ اس کے انعامات سب پر عام ہیں عام اس سے کہ کوئی اقرار کرے یا نہ کرے عام اس سے کہ کوئی اس کا شکرگزار بندہ ہو یا نہ ہو، یہ اس کی رحمانیت کی شان ہے اور اس کی رحیمی کی شان یہ ہے کہ اس نے انسان کو عقل و اختیار و ذمہ داری دینے کے بعد بغیر ہدایت کے نہیں چھوڑا بلکہ ہدایت کا سلسلہ قائم کیا تاکہ اس کے اوپر حجت تمام ہو جائے اور نیکیوں کی جزا اور برائیوں کی سزا دے اس لئے کہ وہ مالکِ کل بھی ہے، وہ انصاف کے دن کا مالک ہے یہ اس کی رحمانیت کی رحیمی کی شان ہے وہ، ہدایت کو قائم کرنے والا ہے جب اس کی ہدایت آچکی (بندوں کے پاس) اور حجت تمام ہو چکی تو پھر جس کی نجات ہوئی تو اس کی بیّن دلیل سے نجات ہوئی اور جس کی ہلاکت ہوئی تو بیّن دلیل سے اس کی ہلاکت ہوئی، اور میں دُرود بھیجتا ہوں محمد مصطفےٰؐ پر۔ ان پر کہ جن کو رب العالمین نے رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا وہ ذاتِ گرامی کہ جس نے انسان کو زندہ رہنے کا طریقہ بتایا اور جس نے انسان کو موت کا صحیح مقام بتا دیا اس لئے کہ جو شخص موت کا صحیح مقام نہیں جانتا وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ زندہ کیسے رہا جاتا ہے،

ایک حقیقت کو بھلانے کی کوشش کرنا موت سے اغماض کرنا موت سے اپنی آنکھیں پھیرنا اس سے حقیقتیں بدلا نہیں کرتیں۔ حقیقتوں کو قبول کرنے سے حقیقتوں سے ادراک کا رابطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ کہ جس نے ہمیں موت کا مقام بھی بتلا دیا اور شہادت کا وہ فلسفہ دیا کہ جس میں موت اور زندگی کا تضاد ہی مٹ جاتا ہے اور رسولِ امین کی وہ ہدایت کہ جس پر آسمان و زمین نے شہادت دی کہ بیشک ہدایت کا حق اس امانت داری کے ساتھ ادا کیا گیا جو اس ہدایت کا حق تھا اور جس کی اس ہدایت کو ضرورت تھی۔

عزیزانِ گرامی! اللہ تعالیٰ نے بندوں سے خطاب کیا ہے اور یہ بات کہی ہے کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں، ایک دوسری جگہ پھر اسی کا عہد ہے کہ اے بنی آدم کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت مت کرنا وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے اور میری عبادت کرنا اس لئے کہ صراطِ مستقیم یہی ہے، اور انسانوں کی روحوں نے اس پر اعتراف کیا، اس کو تسلیم کیا، انھوں نے کہا کہ بے شک ہمارا رب تو ہی ہے اور ایک موقع کے اوپر، عزیزانِ گرامی! جس وقت کہ آخری حج کا موقع تھا اس وقت حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے تمام مسلمانوں سے جو اس وقت تمام انسانوں کی نمائندگی کر رہے تھے، ان سے بھی ایک سوال دریافت کیا وہ یہ تھا کہ اے لوگو کیا میں نے ہدایت کا حق ادا نہیں کر دیا اور لوگوں نے انسانیت کی زبان میں ان لوگوں کے ذریعے سے جو وہاں موجود تھے، جواب دیا کہ بے شک تو نے ہدایت کا حق ادا کر دیا، اللہ رب العالمین ہے اور رسولؐ عالمین کی ہدایت کرنے والا ہے اور ہمارا اسلام ہو ائمہ ہدیٰ پر جن کے وجودِ مقدس سے تاریخ نے اس بات کی شہادت دی کہ بے شک رسولؐ کی ہدایت رسولؐ کی تعلیم مکمل ہوئی، وہ کہ جو سرِّ نبوت کے امین ہیں وہ کہ جو علمِ نبوّت کی ودلیعت گاہ ہیں وہ کہ جو حکمتِ نبوّت کا ملجا و ماویٰ ہیں، وہ کہ جن کی ذات ایک روشن آیت ہے جسے تاریخ نے ہمارے سامنے پیش کیا، ہمارا اسلام ان ہدایت کرنے والوں پر اور ان کے اوپر بھی کہ جنھوں نے ان کی ہدایت قبول کی ہم اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ بے شک نبیؐ نے ہادی ہونے کا حق ادا کیا اور امام نے راعی ہونے کا حق ادا کیا اس لئے کہ نبی کا مقام ہدایت کرنا ہے، اور امام اپنے گلہ کا نگہبان ہوتا ہے یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ گلہ غلط راستے کے اوپر تو نہیں چل رہا ہے

کچھ اس میں سے صراطِ مستقیم سے ہٹ کر غلط راستے کے اوپر تو نہیں جا رہے ہیں، ہادی نے اپنی ہدایت کا حق ادا کر دیا اور راعی نے اپنی نگہبانی کا حق ادا کر دیا۔

عزیزانِ گرامی! کل میں نے اس منبر کے متعلق کچھ آپ سے عرض کیا تھا، ذکر کے آداب شرائط کے متعلق میں نے آپ سے عرض کیا تھا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کی ضرورت اور اس کی اہمیت کے متعلق آپ کے سامنے ذکر کیا اور میں نے یہ ذکر کیا کہ ذکر امام حسین علیہ السّلام نے کیا کیا اور کن کن موقعوں کے اوپر کیا اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ ہے کہ تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کروں گا جو اللہ تعالیٰ کے ذکر کو بلند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذکر کو بلند کرتا ہے اور میں نے یہ بھی اشارتاً ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ذکر کو کس طرح بلند کیا اور ہم اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ منبر کا وہ مقام ہے کہ اگر کسی قوم کی حالت دیکھنی ہو تو منبر کو دیکھ لو اور یہ دیکھ لو کہ کیا تلقین اور کیا نصیحت یہاں سے ہو رہی ہے تو منبر کا یہ مرکزی مقام ہے اور جہاں تک ذکرِ حسینؑ کا تعلق ہے تو اچھی طرح سے ہم یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ ہم اس ذکر کو قائم کئے ہوئے نہیں ہیں اس ذکر کو قائم کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس ذکر کو بلند کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے ہم تو اس ذکر میں شرکت کر کے کچھ اپنے لئے سعادت حاصل کرتے ہیں اور اگر تم ذکر کی تاریخ کو دیکھو تو تمھیں معلوم ہو کہ بے شک مشیتِ ایزدی یہی ہے کہ یہ ذکرِ حسینؑ قائم رہے اور یہ ذکر بلند کرتا رہے اس لئے کہ انسانوں نے اس ذکر کو ختم کرنے کی جتنی ممکن کوشش تھی وہ کر لی اور اس کے باوجود کہ جتنی کوشش کی گئی کہ اس ذکر کو کسی طرح ختم کیا جائے اس ذکر کو دبایا جائے اتنا ہی یہ ذکر بلند ہوتا چلا گیا۔ ہمارے اس ذکر کی جو ہم کسی وقت مجلس برپا کر لیتے ہیں اس کی کیا اہمیت ہے اس ذکر کے مقابلے میں کہ جس میں لوگ ایمان رکھنے والے مودت کی شمع اپنے دل میں روشن کرنے والے اپنے ہاتھ اور بازو عیب زدہ کر کے قبرِ امام حسینؑ کی زیارت کیا کرتے تھے، وہ امام حسینؑ کے ذکر کو بلند کیا کرتے تھے، دنیا نے وہ موقعے بھی دیکھے ہیں اور وہ زمانہ بھی دیکھا ہے کہ جب اس بات کی اجازت حاکمانِ وقت کی نہیں تھی کہ امام حسین علیہ السّلام کا ذکر فضا میں کیا جائے، اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ذکرِ امام حسین علیہ السّلام کو قائم رکھا۔ یہ ہماری سعادت ہے، یہ ہمارے

لئے باعثِ ثواب ہے، ہماری شرافت اور انسانیت ہے کہ ہم اس ذکرِ امام حسینؑ میں حصہ لیں۔ ذکرِ حسینؑ میں حصہ لینا گویا اس بات کی دلیل ہے کہ ہم کچھ انسانی قدروں کو مانتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کو مانتے ہیں ابھی ہمارے دل میں دھندلا سا اتنا نقش موجود ہے کہ حق کس کو کہتے ہیں اور باطل کس کو کہتے ہیں، ابھی ہم یہ بات بھولے نہیں، ابھی یہ بات ہمارے دل سے محو نہیں ہوئی۔

عزیزانِ گرامی! یہ میں نے کل اپنی تقریر کے ابتدائی کلمات کے طور پر کچھ عرض کیا تھا، آج میں یہ بات چاہتا ہوں کہ اسی منبر سے جو کچھ تاریخ نے آوازیں ضبط کر لی ہیں اور جو انسانیت کے قلوب میں اُتر چکی ہیں تو اُن کا کچھ مختصراً ذکر کروں کہ اس منبر سے کیا باتیں کہی گئیں کس طریقے سے تذکیر کی گئی، کس طریقے سے نصیحت کی گئی، کونسا پیغام پہنچایا گیا، تو تھوڑا سا اس بات کا ذکر کر لیں اس کہ تذکیر کو دہرانا بھی تذکیر ہے نصیحت کا اعادہ یہ بھی ایک ذکر ہے یہ بھی ایک بات کو یاد دلانا ہے اور اس کو حاضر کرنا ہے اپنے قلب اور اپنے ذہن کے اوپر تو پہلے تو آپ یہ بات دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جس وقت بعثت ہوئی یعنی جس وقت کہ آپ کو اس بات کا حکم ہوا کہ آپ اسلام لوگوں تک پھیلائیں، دین لوگوں تک لے کر جائیں تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کلمہ کہا اور وہ یہ بات کہی کہ اے لوگو یہ بات کہو کہ سوائے اللہ کے اور کوئی اللہ نہیں ہے اور فلاح پاؤ یہ کہو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور فلاح پاؤ ایک کلمہ، ایک کلمہ، اس موقع پر ایک نکتہ ذرا ملحوظِ خاطر رہے اور وہ یہ ہے کہ دین اس طرح نہیں پھیلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی کتاب اتری ایک مکمل کتاب، انھوں نے لوگوں کے سامنے پیش کی اور لوگوں نے اس پر غور کیا اور اس کے متعلق بحث کی اور اُس کو سوچا اور سمجھا اور یہ سمجھے کہ یہ واقعی ہمارے فائدے میں ہے اور اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہوا ہے تو اس پر عمل کریں تو دین اس طرح سے نہیں پھیلا کہ تا کہ ایک BLUE PRINT بلو پرنٹ موجود ہے اور اس پر عمل کرنا ہے بلکہ دین کی تمثیل کلام پاک کے اندر یہ دی گئی ہے اور ہمیں یہ بتایا گیا کہ پچھلے صحیفوں میں بھی دین کے پھیلنے کی تمثیل یہ ہے کہ جس طرح سے بیج بویا جاتا ہے اور وہ بیج بڑھتا ہے تو پھر اس کے اندر

برگ وبار پھیلتے ہیں اور وہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو جاتا ہے اس طرح سے دین پھیلا کرتا ہے، اس طرح سے نہیں پھیلتا کہ کوئی پروگرام ہے، بلیو پرنٹ ہے کوئی کتاب ہے۔ لوگ اس کے اوپر غور و خوض کر رہے ہیں بلکہ اس طرح سے پھیلتا ہے ایمان کا بیج دل میں انسان لوتا ہے پھر اس کے جو کچھ بھی آداب و شرائط ہیں اس کو پورا کرتا ہے۔ وہ زندگی کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے، وہ بیج دل میں اُگتا چلا جاتا ہے۔ شروع شروع میں وہ کچھ کمزور نظر آتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مضبوط کرتا ہے، اس کی جڑیں زمین کے اندر ہوتی ہیں، اس کی شاخیں تمام آسمان پر پھیل جاتی ہیں اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہتا کہ جس کو اس کی شاخیں ڈھانپ نہ لیں۔ تو دین کی اشاعت کی تمثیل کلامِ پاک کے اندر یہ ہے، کسی جگہ یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک کتاب نازل ہوئی اور اس کے اندر اقتصادی نظام تھا اور اس کے اندر سیاسی نظام تھا اور اُس کے اندر اخلاقی نظام تھا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ سارے کے سارے نظام لوگوں کے سامنے پیش کئے ہوں اور لوگوں نے سوچا ہو کہ واقعی یہ نظام تو تمام نظاموں سے بہتر ہے اور اس کے بعد اس کو قبول کیا ہو! یہ طریقہ دین کے پھیلانے کا نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان ان تمام تعلیمات کی روح ہے۔ تو اگر وہ بیج نہیں ہے، اگر وہ روح نہیں ہے تو پھر جس طرح سے اگر تم بغیر بیج کے ان شاخوں اور ٹہنیوں کو جمع کر دو تو وہ درخت نہیں بنتا، جب تک کہ انسان کے اندر روح نہ ہو تم اس کے اعضاء کو جمع کر دو تو وہ انسان نہیں بن جاتا تو اس قرینے سے بغیر اس بیج کے، بغیر روح کے تم جتنے نظام اس کلامِ پاک سے نکالنا چاہتے ہو وہ سیاسی نظام ہوں یا اقتصادی نظام ہوں یا اخلاقی نظام ہوں یا معاشرتی نظام ہوں تم ان سب کو جوڑتے چلے جاؤ تمہارا کام اتنا ہی مضحکہ خیز ہو گا، جس طرح اعضائے انسانی کو جوڑنے کے بعد یہ سمجھ لیں کہ ہم نے ایک مکمل انسان بنا لیا۔

تو دین ایک زندہ حقیقت ہے اللہ کا رسولؐ جس وقت کہہ رہا تھا کہ اے لوگو یہ کہو کہ سوائے اللہ کے کوئی اللہ نہیں ہے اور فلاح پاؤ تو وہ گویا انسانی قلب کے اندر وہ بیج بو رہا تھا جس وقت ایک درخت کی صورت اختیار کر لی تو پہلا پہلا ہی کلمہ یعنی کلمۂ صدق تو وہ تھا

کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے لوگوں تک پہنچایا اور اس کے بعد آخری تعلیم آپ کی آخری خطبہ آپ کا وہ حج کے موقعہ کے اوپر دو مقامات کے اندر ایک منیٰ کے اندر، ایک غدیر کے موقع پر وہ آخری خطاب تھا آپ کا لوگوں سے، میں اس آخری خطاب کے متعلق جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے موقع پر کیا ہے اور جس کی تاریخ کے اندر زبردست اہمیت ہے تو اس کے متعلق کچھ آپ سے عرض کروں گا اس خطبے کی مختلف روایتیں ہم تک پہنچیں۔ وہ خطبہ من وعن ہم تک نہیں پہنچا بلکہ اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ کونسا حصّہ کس مقام پر ارشاد فرمایا، عام طور سے اتفاق اس بات کے اوپر ہے کہ ان خطبات کا جو مختلف متن ہمارے سامنے موجود ہیں تو ان کو منیٰ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشاد فرمایا یہ وہ موقع ہے کہ جب تمام جزیرۃ العرب قریب قریب مسلمان ہو چکا تھا اس موقع کے اوپر کہا یہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد اٹھارہ ہزار سے کم نہیں تھی، اس لئے کہ حضورؐ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ یہ گویا ان کا آخری حج ہے، حضورؐ خود تشریف لے جا رہے تھے اس حج کے لئے اس موقع کے اوپر تمام لوگوں کو ہدایت تھی کہ تم جتنے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو اپنے لاسکتے ہو اُن کو لے آؤ، اتفاق ایسا ہے کہ جو آیاتِ قرآنی پڑھی جا رہی تھیں وہ بھی حج کے متعلق تھیں، یہ گویا اسلامی عبادات کی ایک بڑی اہم عبادت پوری کی جا رہی تھی، ایک خاص بات دیکھنے کی یہ ہے کہ یہ اسلامی عبادات میں سے ایک بڑی زبردست عبادت کا موقع ہے اس وقت تمام کی تمام انسانیت کھنچی ہوئی اپنے مرکزِ حقیقی کی طرف آگئی ہے، کعبۃ اللہ محسوس مرکز ہے تمام عالمِ انسانیت کا چاروں طرف چوبیس گھنٹے طواف ہوتا رہتا ہے جس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اس لئے کہ ذرا سا ایسا تصوّر کریں کہ دنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے، کوئی وقت ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی نہ کسی ملک کے لوگ اس کی طرف رُخ کر کے نماز نہ پڑھ رہے ہوں، یہ دائرے کہ جن کا مرکز ایک ہے کعبۃ اللہ کے گرد یہ دائرے پھیلتے ہوئے تمام کی تمام انسانیت کو احاطہ کئے ہوئے ہیں اور پھر دوسری طرف اس بات کو سوچو کہ یہ کون سی جگہ ہے کن کن نبیوں اور کن کن ولیوں کے پاؤں اس جگہ پڑ چکے ہیں۔ (یہ وہ مقام ہے) اس مقام کے اوپر اس مرکز کے اوپر، اس ہدایت کے مطابق

کہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہو جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا آخری خطبہ، اپنا آخری پیغام لوگوں تک پہنچا رہے ہیں، اس پیغام کا جو حصّہ رہ گیا تھا وہ اور جو ضروری حصّہ تھا کسی مصلحت سے اس موقع کے اوپر نہیں بیان کیا گیا، اب اللہ تعالٰی کی مشیّت یہ ہوئی کہ وہ بیان کیا جائے اسے غدیرِ خُم کے موقع پر بیان کیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی آخری وصیّت سمجھ لو جو حضورؐ نے ہم تک پہنچائی ہے اور دونوں موقعوں کے اوپر حضورؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ ہدایت تھی کہ جو حاضر ہیں وہ ان باتوں کو یاد رکھیں اور جو غائب ہیں ان تک اس کو پہنچا دیں ایک نسل دوسری نسل کو پہنچا دے، ایک جو یہاں موجود ہے تو وہ دوسرے تک پہنچا دے حضورؐ نے بہ تاکید دونوں موقعوں پر انسانوں کو مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت کی ہے تاکہ یہ خطبات اور ارشادات تاریخ کے اور قلبِ انسانی کے اندر محفوظ ہو جائیں اور ثبت ہو جائیں، ایک خاص بات جو آپ اس خطبے کے اندر دیکھیں گے تو وہ یہ ہے کہ اس خطبے کے اندر اس کے باوجود کہ ایک بڑا زبردست ایک بڑا اہم عبادت کا رکن پورا کیا جا رہا ہے۔ ان عبادات کا ذکر نہیں ہے، یہ ذکر نہیں ہے کہ لوگو تم نماز پڑھا کرو، لوگو تم روزے رکھا کرو، یہ ذکر نہیں ہے اس کے اندر اس لئے کہ وہ تو تمام کا تمام مکمل ہو چکا۔ اب اس میں معاملات کا ذکر ہے، لوگوں کو یہ بات بتا دینا ہے کہ عبادات محض کچھ ارکان کا ادا کرنا نہیں ہے۔ عبادت کی ایک مرکزی حیثیت ہے، لیکن مرکز تو وہ ہوتا ہے جو چاروں طرف پھیلنا شروع ہوتا ہے جب وہ چاروں طرف پھیلنا شروع نہ ہو تو وہ مرکز کیا ہوا وہ تو ایک رسم بن گئی، اگر زندگی کے اندر نماز کی روح جاری وساری نہ ہو تو پھر ہم نماز کو اپنی زندگی کا مرکز کس طرح سے کہہ سکتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اسی کلمے کو پہلے کلمے کو وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہو اور فلاح پاؤ اس کو آپ زندگی کے مختلف شعبوں کے اندر ظاہر فرما رہے ہیں۔ اس کا بیان آپ فرما رہے ہیں، ایک بات اور ذرا یاد کراؤں اور وہ بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اس دنیاوی زندگی سے اور اس دنیاوی زندگی میں رہتے ہوئے ہم حیاتِ طیّبہ کو سمجھیں ہم پاک حیات کا، ایمان والی زندگی کا مقصد سمجھیں۔

اور عزیزانِ گرامی! اس بات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ جس وقت آدمی اس

حیاتِ طیبہ تک پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ انعام کے طور پر اور امتحان کے طور پر اس کو طاقت اور حکومت بھی دے دیا کرتا ہے اور وہ طاقت و حکومت اس لئے دیا کرتا ہے تاکہ اس حیاتِ طیبہ کو اور زیادہ فروغ ہو، طاقت فی نفسہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی انسان تمنا کرے اور میں یہ بات خاص طور پر کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس کر رہا ہوں کہ کچھ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس حیاتِ طیبہ کو لانے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ہاتھ میں طاقت آجائے تو اس وقت ہم اس حیاتِ طیبہ کو لاکے دکھائیں گے، میں عرض کروں کہ وہ طاقت وہ جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی واقعی طاقت ہے وہ تو نتیجہ ہی اس حیاتِ طیبہ کا ہوتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ طاقت پہلے آجائے اور حیاتِ طیبہ بعد میں آئے اور وہ حیاتِ طیبہ اس کے مختلف شعبے ہیں، ایک معاشرے کی زندگی ہے، ایک انفرادی زندگی ہے اور ہم اہلبیتؑ سے مودت رکھنے والے ایک شعبے کے اوپر اور زور دیتے ہیں اور یہ اور بات کہا کرتے ہیں کہ اے لوگو صرف فرد اور معاشرہ نہیں ہوا کرتا بلکہ ایک ادارہ "بیت" کا بھی ہوتا ہے، ایک مقام اہلِ بیت کا بھی ہوتا ہے اور جس وقت تک کہ تمھارے گھر ٹھیک نہیں ہوں گے تو اس وقت تک نہ فرد ٹھیک ہوگا اور نہ معاشرہ ٹھیک ہوگا تو جس وقت کہ تم معاشرے کو دیکھو اور فرد کو دیکھو تو اس وقت تم بیت کو مت بھول جانا اہلِ بیت کو مت بھول جانا اس لئے کہ یہ اس تعلیم کا لازمی جزو ہے۔ اگر تمھارے گھر بگڑ گئے اور جس وقت کہ تمھارے گھروں کے اندر فساد پہنچ گیا تو یہ ناممکن بات ہے کہ فرد کی اصلاح ہو سکے اور معاشرے کی اصلاح ہو سکے تو گویا یہ تمام باتیں اور یہ تمام شعبے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے سامنے ہیں، فرد کے متعلق اور بیت کے متعلق گھر کے متعلق اس خطبے کے اندر خاص طور کے اوپر عورتوں سے سلوک کے اوپر زور دیا گیا ہے تو گھر کے متعلق اور معاشرے کے متعلق ارشاد فرمایا گیا، یہ تمام کے تمام حیاتِ طیبہ کے شعبے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیشِ نگاہ ہیں اور اب اس کے بعد ایک اور غور کرنے کی بات ہے کہ خطاب جو ہوتا ہے تو وہ ایہا الناس خطاب ہوتا ہے یعنی یہ نہیں کہ اے مسلمانو! اے مومنو! بلکہ اے انسانو! اے لوگو! تو یہ خطاب پوری انسانیت سے ہے گویا یہ ایک

بنیاد ہمیں بتائی جا رہی ہے، انسانی زندگی کی، انسانی شرافت کی انسانیت کے احترام کی اور اُس کے بعد اللہ کا رسولؐ ہمیں ہدایت کرتا ہے بلکہ ہمیں وصیت کرتا ہے کہ اے لوگو ایک دوسرے کے جان و مال تمھارے لئے محترم ہیں۔ یہ تمھیں ہر جگہ مل جائے گا، جان کا احترام کرو اور پراپرٹی (PROPERTY) کا احترام کرو یہ تو ہر جگہ تمھیں مل جائے گا کہ جان و مال محترم ہیں جس طرح سے یہ دن محترم ہیں جس طرح سے یہ مقام محترم ہیں گویا تقدس کے معنی یہ ہوئے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ محض کچھ علامات اور کچھ مقامات اور کچھ رسوم محترم ہیں۔ بلکہ جان کو محترم سمجھو، مال کو محترم سمجھو، اس کو مقدس سمجھو احترامِ انسانیت کرو اور احترامِ آدمیت کرو اور احترامِ آدمیت کے طور پر جان و مال جو ہیں وہ تمھارے لئے محترم ہیں ایک دوسرے کے، سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو فقرہ بیان کیا تو وہ یہ فقرہ بیان کیا اور کیوں نہ ہو اللہ کا رسولؐ ہے اور انسانوں سے خطاب ہے تو سب سے پہلی بات تو احترامِ انسانیت کی ہونی چاہیئے یعنی کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ آدمی کی انسانیت ذلیل ہو، ایک بات میں آپ سے اور عرض کر دوں کہ یہ انسانیت کس وقت ذلیل ہوتی ہے وہ آدمی خود ذلیل ہوتا ہے جو اپنے سے اوپر سطح کے اوپر جو لوگ بیٹھے ہیں ان کو اپنے سے بالا سمجھنے لگتا ہے۔ اور آدمی انسانیت کی تحقیر کرتا ہے جس وقت جو لوگ اس سے نیچے ہوتے ہیں تو ان کو انسانیت کی سطح سے نیچے سمجھنے لگتا ہے یوں انسان خود انسانیت کی تحقیر کرتا ہے، بہت کم ایسے کریمؑ جواد ہوتے ہیں کہ جو اونچا بیٹھا ہوا ہو اس کو بھی انسان سمجھیں اور جو نیچا ہے اس کو بھی انسان سمجھیں یہ بہت کم اور بہت مشکل بات ہے۔

اور ایک بات میں آپ سے عرض کروں اور وہ یہ ہے کہ خاص طور کے اوپر اس کا تقدس جو بیان کیا جا رہا ہے تو اے عزیزانِ گرامی! انسان کی جان یا مال کے احترام کرنے کا کیا جواز ہے تم کوئی سے جواز ڈھونڈو، تم یہ کہو گے کہ ہم جان و مال کا احترام اس لئے کرتے ہیں تاکہ ہماری جان و مال محترم رہے، ہماری جان و مال محفوظ رہے زیادہ سے زیادہ یہ بات تم کہو گے، لیکن اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بتاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا رسولؐ یہ بتاتا ہے کہ یہ مقدس ہیں، ان میں تقدس ہے، ان کا احترام اس لئے کرو کہ تمھارے اور ان کے بیچ میں

اللہ تعالیٰ کا رشتہ ہے، تم میں سے دو ہوں تو تیسرا اللہ ہوتا ہے، تین ہوں تو چوتھا اللہ ہوتا ہے تو اس بات کو تم مت بھولو کہ یہ بندہ کہ جس سے تمہارا واسطہ پڑا ہے، اور جس سے تم سلوک کر رہے ہو اور جس کے جان و مال کو میں نے محترم کیا ہے۔ یہ بھی اسی اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے چنانچہ امیر المومنینؑ نے مالکِ اشتر کو یہ بات فرمائی جس وقت کہ مصر کی گورنری کے اوپر بھیجا کہ اے مالک! تم یہ بات مت بھولنا کہ جن لوگوں سے تمہارا واسطہ ہے ان میں کچھ مسلمان ہیں اور کچھ غیر مسلم ہیں تو مسلمان تو دین کے اندر تمہارے بھائی ہیں، اور غیر مسلم وہ اللہ کے بندے ہونے میں تمہارے شریک ہیں جس طرح سے تم اللہ کے بندے ہو، اسی طرح سے وہ اللہ کے بندے ہیں سوائے اس رشتے کے اور کوئی بنیاد آپ معلوم نہیں کر سکتے کوئی بنیاد دریافت نہیں کر سکتے کہ کیوں ایک آدمی دوسرے آدمی کا احترام کرے کیوں ایک آدمی دوسرے کی جان و مال کا احترام کرے، کیوں ان کو مقدس سمجھے جس طریقے سے کہ حج مقدس ہے اور جس طریقے سے منیٰ مقدس ہے اور جس طرح سے مقامِ کعبہ مقدس ہے کیوں ان کو اس طرح سے محترم سمجھے، اس تصور کی سوائے اس رشتہ کے جو ابھی بیان کیا گیا اور کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا ارشاد جو تھا تو وہ تو یہ تھا اور دوسرا ارشاد حضورؐ کا یہ تھا کہ اے لوگو تم اپنے افعال کے خود ذمہ دار ہو، تم اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بات کا، اپنے جو کچھ بھی تم اعمال کرتے ہو اس کا حساب دو گے، یہ چیز وہ ہے کہ جس سے انسانیت اپنے پورے شرف پر پہنچتی ہے، اس سے انسانیت اپنی پوری بلندی پر پہنچتی ہے، یہ آزاد آدمی کا شرف ہے، گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ہر غلامی سے آزاد کر دیا گیا ہے اب انسان کو خود اپنا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے، اس امانت کو یاد دلایا گیا کہ جو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو پیش کی، پہاڑ اس کو اٹھانے سے معذور تھے، اس نے انسانوں کو پیش کی اور انسانوں نے اس امانت کو، اس ذمہ داری کو اٹھایا اور جس انسان نے اس ذمہ داری کو علم سے اور عدل سے پورا کیا وہ فلاح پا گیا، جس انسان نے علم سے اور عدل سے اس کو پورا نہیں کیا، قرآن کے الفاظ میں ظالم و جاہل ہوا اور وہ ہلاک ہوا اور وہ ہلاکت کی طرف پہنچا تو دوسری آپ نے جو دعوت پیش فرمائی وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہمیشہ ذمہ دار سمجھو۔ لوگ تمہارا

شرف یہ مقامِ انسانیت ہے، یہ معراجِ انسانیت ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، یہ وہ منزل ہے کہ جس کے اندر آدمی کسی دوسرے آدمی کو اپنی نگاہ میں اس طرح سے نہیں لاتا کہ مجھے اس کے سامنے جواب دینا ہے، اپنے فعل کا، اپنے عمل کا جواب جو دینا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دینا ہے، پھر اس کے بعد دنیا اگر مخالف ہو جائے اور اس کو باطل پر جھکانے کی کوشش کرے، تو کسی صورت بھی وہ آدمی باطل کے سامنے نہیں جھک سکتا کہ جس کے دل میں یہ بات گہری اتر چکی ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا جواب دینا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے جو دوسری بات کی اور دوسری وصیت جو فرمائی تو وہ یہ تھی کہ لوگو تم اپنے خدا کے سامنے اپنی تمام باتوں کے جواب دہ ہو اور پھر اس کے بعد آپ نے جو وصیت فرمائی تو وہ دو خاص چیزوں کو منع کیا، ایک سود کو منع کیا اور ایک جاہلیت کے اندر جو خون ہوئے تھے ان کو منع کیا اور ان کو ذرا دیکھو ان ارشادات میں ایک مختصر بات کو آپ دیکھیں کہ کسی آدمی کے پاس طاقت زیادہ ہوتی ہے، مال بھی ایک طاقت ہے یہ طاقت کچھ آدمیوں کے پاس کم ہوتی ہے، اب ان لوگوں کا جن کو مال اور طاقت اللہ نے زیادہ دے رکھی ہے ان سے کیا تعلق ہونا چاہیئے جن کے پاس طاقت اور مال کم ہے ایک مختصر سا اصول یہ ہے کہ اگر آپ اس طاقت و مال سے دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور دوسروں کو اپنے برابر کھڑا کرتے ہیں تب تو کوئی نیک کام ہے اور اگر اس طاقت و مال کو آپ اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ دوسروں کو کمزور کریں ان کا استحصال کریں ان کے اوپر اپنا جبر قائم کریں تو یہ بات گناہ ہے یہ گویا انسانیت کا اور اللہ تعالیٰ کا گناہ ہے۔

تیسری بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو فرمائی تو اس بات کو اس طرح سے سمجھ لو کہ انسان اور انسان میں ایک رشتہ اور مسلمان اور مسلمان کے مابین ایک رشتہ قائم ہو گیا اب کوئی بھائی زیادہ مضبوط ہے زیادہ اچھے مقام پر ہے دوسرا بھائی اس سے کم مقام پر ہے، کمزور ہے اب اس بھائی کا جو اچھے مقام پر ہے۔ فرض یہ ہے کہ اپنے کمزور بھائی کا ہاتھ پکڑ کے اپنے برابر کھڑا کرے تا کہ اس کو تقویت حاصل ہو نہ یہ کہ اپنی

طاقت کو اور اللہ تعالیٰ نے جو انعام اس کو دے رکھا ہے تو اس کو غلط استعمال کر کے کمزور کو اور کمزور کرتا چلا جائے اس لئے کہ اگر اس کو وہ اور کمزور بناتا چلا جاتا ہے تو یہ تمام کی تمام خاندان کی کمزوری ہے، اگر وہ چھوٹا بھائی کمزور بھائی اگر وہ بھی طاقتور ہو کے اس بھائی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے تو وہ بھی اپنے بھائی کا قوتِ بازو ہوتا ہے تو اس استحصال کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے، اور آپ نے فرمایا کہ وہ انتقام کے خون تھے جو نسلاً بعد نسلٍ چلتے تھے، قبیلوں کے اندر چلتے تھے، ان کو میں معاف کرتا ہوں وہ کیوں؟ تو وہ اس وجہ سے کہ اب عہدِ جاہلیت ختم ہو چکا، اب قانون کا دَور دَورہ ہے اب جو کوئی بھی کام کیا جائے گا تو وہ ایک آئین کے مطابق کیا جائے گا اور جس کام سے روکا جائے گا اس کو ایک آئین کے مطابق روکا جائے گا تو گویا حضورؐ نے یہ بات وصیّت کے طور پر فرمائی اور پھر حضورؐ نے فرمایا کہ اور لوگو اب شیطان اس بات سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اب ایک بات میں اس ضمن میں عرض کروں، وہ یہ کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تعلیم کا معجزہ ہے اور یہ دیکھو کہ وہ قومیں بھی کہ جو تین خداؤں کو مانتی ہیں اور وہ قومیں بھی جو بہت زیادہ خداؤں کو مانتی ہیں تو وہ قومیں بھی بہت زیادہ مضطر نظر آتی ہیں کہ وہ اس بات کو ثابت کریں کہ حقیقت میں تو ہم خدائے واحد کو مانتے ہیں، دوسرے معبود تو اس کے مظاہر ہیں تو کوئی قوم آپ کو نہیں ملے گی جو کہے کہ ہاں ہمارے تو بہت سے خدا ہیں۔ بلکہ وہ یہ کہیں گے یہ دیوتا اور دیویاں جو ہیں تو یہ تو ایک طریقہ ہے اسی خدا تک پہنچنے کا، حقیقت میں تو ہم بھی خدائے واحد کے ماننے والے ہیں تو عزیزو یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جو توحید کی تعلیم لوگوں کو دی ہے یہ اس کا کرشمہ ہے، ایک کرشمہ اور اس بات میں دیکھتے چلو کہ مسلمانوں سے آپ نے یہ بات فرمائی کہ دیکھو تم یہ بات کہو کہ ہم نبیوں میں سے کسی نبی میں فرق نہیں کرتے، تم یہ بات کہو کہ تمام کے تمام نبی ایک ہی حقیقت کو دنیا کے اندر لے کے آئے اور اس بات کو بھی تم دیکھو، اس معجزے کو بھی تم دیکھو کہ مسلمانوں کی اور یہودیوں کی لڑائی ہوتی ہے، مسلمانوں کی اور عیسائیوں کی لڑائی ہوتی ہے۔ وہ لڑائی اپنی جگہ اور وہ لڑائی بھی ایسی کہ موت اور زندگی کا سوال ہو لیکن کسی

منبر کے اوپر جناب موسیٰؑ کے اقوال دہرائے جارہے ہیں کہیں جناب عیسیٰؑ کے اقوال دہرائے جارہے ہیں اور جناب موسیٰؑ اور جناب عیسیٰؑ کے اقوال دہراتے وقت خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کافر ہوگا جو یہ کہے کہ یہ ہمارے نبی نہیں ہیں یہ تو ان قوموں کے نبی ہیں جن سے ہماری موت اور زندگی کی جنگ جاری ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات فرمائی کہ شیطان اس بات سے تو مایوس ہوگیا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے لیکن اب بات اور طرح چلتی ہے، شیطان اس بات سے مایوس ہو کے کہ میں اپنی عبادت نہیں کرواسکتا اس بات سے مطمئن ہوگیا ہے کہ تمہارے افعال کے اندر اور تمہاری ہمتوں کے اندر خلل ڈالے۔ اب رہا شیطان کا بہکانا وہ طرح طرح کا ہوتا ہے شیطان کا بہکانا جو نفس کے ذریعے سے وہ بہکاتا ہے تو وہ ہوتا ہے جس کے اندر آدمی شرکِ جلی نہ کرے شرکِ خفی کرجاتا ہے اور اگر شرکِ خفی کو تم دیکھنا چاہو تو وہ بہت عام ہوتا ہے مثلاً جس وقت تم کسی انسان کو سمجھو کہ وہ تمھیں نفع پہنچا سکتا ہے یا ضرر پہنچا سکتا ہے جس وقت کہ تم اپنے خوف یا امید کو کسی انسان سے وابستہ کرو تو یہ شرک ہے۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ یہ بات کہتا ہے کہ نفع پہنچانے والا میں ہوں، ضرر پہنچانے والا میں ہوں، موت اور زندگی میرے ہاتھ میں ہے، نشور میرے ہاتھ میں ہے، بغیر میرے کسی کو یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی کو نفع پہنچا سکے یا کسی کو ضرر پہنچا سکے یا کسی کو زندہ کرسکے یا کسی کو مار سکے یا مارنے کے بعد کسی کو اٹھا سکے، اگر ہم کسی انسان کے متعلق ایسا تصور رکھتے ہیں تو یہ شرک ہے، جس وقت کہ ہم یہ بات کہتے ہیں یہ گویا دوسرے معنی میں غیر اللہ کی عبادت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا دیکھو اس بات کے اوپر اپنی نگاہ رکھنا، اس بات کو غور سے دیکھتے رہنا کہیں یہ شیطان تمھیں اس طرح سے تو نہیں بہکا رہا ہے، تمہارے اندر کمزوری تو نہیں ڈال رہا ہے، اور پھر حضورؐ نے ایک بات اور فرمائی اور وہ یہ کہ دیکھو شیطان کے بہکانے میں آکے کافر اور گمراہ مت ہوجانا، کافر گویا اب یہ تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی انکار کرے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ دو خداؤں کو مانے یا چار خداؤں کو مانے یا دس خداؤں کو مانے چنانچہ آپ کو وہ لوگ تو مل جائیں گے کہ جو اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں اور کفر کرتے ہیں، لیکن وہ لوگ نہیں ملیں گے، جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ دو ہیں تین ہیں یا دس ہیں۔

گویا اللہ کو ایک سے زیادہ ماننے والے نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگ بھی کسی نہ کسی صورت میں توضیح کرتے ہوئے ملیں گے کہ ہم تو اللہ واحد کو ماننے والے ہیں اور پھر اسی موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہر آدمی کی طبیعت کی مناسبت سے شیطان کے پاس بہکانے کے طریقے ہیں، ان سے خبردار رہنا اور دیکھو یہ مت کرنا کہ آپس میں تم لڑنا شروع کر دو، طاقت اور اقتدار کے پیچھے اور لفظ جو ہے تو وہ یہ ہے کہ مالک الرقاب بن گئے ہو، لوگوں کی گردن کے مالک بن گئے ہو، لوگوں کے اوپر سوار ہو جاؤ تم اپنے جبر کی وجہ سے یہ بات مت کرنا اس لئے کہ حاکم اللہ تعالیٰ ہے، یہ بھی شیطان کے بہکانے کا ایک طریقہ ہے کہ تم آپس میں لڑو اور اس کے بعد جو تم میں زیادہ طاقت والا ہو تو وہ اس طاقت کے بل بوتے پر لوگوں کی گردن کا مالک بن جائے، مَالِكُ الرِّقَاب بن جائے تو اللہ کے رسولؐ نے یہ بات کہی کہ دیکھو کسی بندے کی کسی کی گردن کے اوپر حکومت نہیں ہے، کوئی بندہ اس بات کا حق نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے بندے کے اوپر حکم چلائے، محض اس بنا پر کہ اس نے طاقت یا اقتدار کسی نہ کسی طریقے سے غصب کر لیا تو اللہ کے رسولؐ نے اس بات کی وصیت تمام کی تمام انسانیت کو کی اور پھر آپؐ نے فرمایا کہ نسی کفر ہے چونکہ اس کے متعلق اکثر غلط فہمیاں ہوتی ہیں تو اس کو بھی بیان کر دوں ایک رسم تھی جاہلیت کی اندر وہ تھی نسی وہ یہ تھی کہ عرب اپنے مہینوں کو گھٹا بڑھا دیا کرتے تھے، کبھی لڑنے کو جی چاہتا تھا تو جو محترم مہینے تھے جن میں لڑائی منع تھی ان کو آگے کر دیتے تھے اور یہ کون کا مہینہ بن جاتا تھا تو اس طریقے سے وہ اپنے دن کو اُدل بُدل کرتے رہتے تھے، اپنے اس کیلنڈر کو اپنے ان مہینوں کو بدل لیتے تھے تو آپؐ نے یہ بات فرمائی کہ دیکھو نسی جو ہے وہ کفر ہے اور اس کی مصلحت میں آگے آپ کو سمجھاتا ہوں اور وہ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصیت کے طور کے اوپر بیان کر رہے ہیں کہ دیکھو نسی جو ہے یہ کفر کی زیادتی ہے، اللہ تعالیٰ نے بارہ مہینے مقرر کئے ہیں اور چار مہینے اس کے اندر محترم ہیں۔ رجب ہے، ذیقعدہ ہے، ذی الحجہ ہے، محرّم ہے، یہ چار مہینے جو ہیں تو محترم ہیں حضورؐ نے یہ بات فرمائی۔ ایک جگہ کلام پاک کے اندر اسی بات کا ذکر ہے اور عہد جاہلیت کی اسی رسم کا ذکر ہے اور اسی رسم کے بعد اس نسی کا کہ اس طریقے سے مہینوں کو بدلتے ہیں اور

چار مہینے اللہ تعالیٰ نے محترم کئے ہیں اور کلام پاک کے اندر انھیں بارہ مہینوں کے نظام اور چار مہینوں کی حرمت کو دین قیّم یعنی قائم رہنے والا دین کہا ہے، اب اس دینِ قیّم پر اگر غور کریں تو دینِ قیّم ایک اور معنی میں استعمال ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب یوسف علیہ السلام زنداں کے اندر رہیں زندانِ مصر کے اندر اور آپ اپنے قید خانے کے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے لوگو کون سی بات اچھی ہے یہ کہ تم متفرق رہو اور بہت سے خداؤں کو مانو یا یہ بات اچھی ہے کہ تم واحد و قہار اور ایک اس اللہ کو مانو کہ جس کو ہر قسم کا غلبہ اور ہر قسم کی طاقت حاصل ہے اور پھر آپ نے فرمایا کہ دیکھو تم اللہ کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہو وہ محض نام ہیں کہ جو تم نے اور تمھارے آبار نے رکھ دیئے ہیں ان کے اندر کوئی حقیقت نہیں ہے، اصل حاکم تمھارا حقیقی حاکم، صرف اللہ ہے اور اس نے تمھیں یہ حکم دیا ہے کہ سوائے اللہ کے اور تم کسی کی عبادت نہ کرو اور یہی دینِ قیّم ہے، دینِ قیّم کا لفظ اُس جگہ آیا ہے، ایک جگہ دینِ حنیف کا ذکر یوں ہوا ہے کہ یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے جس کے اوپر کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اس لئے سوائے اللہ کے سوائے خدا کے اور کسی کو نہ مانا جائے اور یہی دینِ قیّم ہے کہ سب باطل خداؤں سے اپنا منہ موڑ کے خدائے واحد کی اطاعت کرنا یہ دینِ قیّم ہے گویا دینِ قیّم دو معنی میں استعمال ہوا ہے، ایک تو لا الٰہ الا اللہ اور دوسرے ایک سال کے بارہ مہینے اور کچھ محترم مہینوں کی حرمت کو، اب ذرا غور کی بات ہے اور وہ یہ ہے کہ عزیز و دینِ قیّم کہتے ہیں ایک کو ایک عالمگیر حقیقت کو UNIVERSAL TRUTL . ایک وہ حقیقت کہ جو بنیادی حقیقت ہے جس طرح سے کہ لا الٰہ الا اللہ بنیادی حقیقت ہے جس کو میں نے درخت کے بیج سے تشبیہ دی ہے۔ ہماری زندگی کو سمجھنے کے لئے ہم یہ بات کہتے ہیں کہ عالم دو ہیں ایک عالمِ تکوینی ہے یعنی یہ فطرت اور ایک عالمِ تشریعی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے امر کا جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے اس کو بجا لانے کا نام، گویا حقیقتیں دو ہوتی ہیں ایک تکوینی حقیقت یعنی کون و کائنات سے متعلق یعنی فطرت اور ایک حقیقت تشریعی شرع کی اور قانون کی حقیقت، تو عزیزانِ گرامی! جس طریقے سے عالمِ تشریعی کے اندر ایک حکم یہ ہے کہ تم اللہ کے خلاف

اللہ کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو تو اسی طریقے سے عالمِ تکوینی کے اندر یہ ہے کہ
تم ضبطِ اوقات کرو اس لئے کہ یہ دنیا زمان و مکان کے حدود میں پیدا کی گئی ہے، اگر
تم ضبطِ اوقات نہیں کرو گے، اگر تم ان اوقات کا خیال نہیں کرو گے تو پھر جن چیزوں کو
اللہ تعالیٰ نے مقدس کیا ہے ان کو مقدس نہیں سمجھو گے تو تمھاری تمام کی تمام زندگی کا
نظام ختم ہو جائے گا تو خاص طور سے دینِ قیم یا تو اس بات کے اوپر ہے کہ سوائے اللہ کے
اور کسی کی عبادت نہ کرو اور یا دینِ قیمّ اس بات کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سال کے بارہ
مہینے مقرر کئے ہیں اور چار ان میں سے محترم ہیں، ایک عالمِ تشریع کے لئے اور ایک عالمِ تکوین
کے لئے، ایک اِس دنیا کے لئے اور ایک اُس دنیا کے لئے تو یہ دینِ قیمّ ہے تو گویا تم اگر اپنے
اعتقادات کے اندر اس بات کے اوپر مضبوطی سے جمے ہوئے ہو کہ ہم سوائے اللہ کے اور
کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور اپنی زندگی کے کاروبار کے اندر تم ضبطِ اوقات کے پابند ہو
تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تمھاری زندگی کے عبادات اور معاملات دونوں دینِ قیمّ کے حصار
کے اندر ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ، غریبوں کے ساتھ،
غلاموں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا، یہ پھر وہی بات آگئی کہ تم میں سے وہ لوگ
جو زیادہ مضبوط جگہ کے اوپر ہیں، جو زیادہ اچھے موقع کے اوپر ہیں تو ان کا یہ فرض ہے کہ
ان سے جو کمزور لوگ ہیں ان کے ساتھ رحم سے شفقت سے، نیکی سے پیش آئیں اور ان کو
اپنے برابر تصور کریں اور قانون دو ہوا کرتے ہیں یا تو قانون طاقت اور زور کا ہوا کرتا ہے
یا کسی دوسرے آدمی کے حق سمجھنے کا ہوتا ہے اگر یہ قانون زور کا اور ڈنڈے کا ہے تو پھر ہر
طاقتور ہر کمزور کا مالک ہے اور ہر طاقتور جابر ہے ہر کمزور کے اوپر اور مرد جابر ہے
عورت پر اسی سے مرد کی شرافت کی پہچان ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر
تمام کمزوروں کے اوپر حکومت کرتا ہے یا ان کمزوروں کو بھی اپنے برابر سمجھتا ہے، اور
انسانیت کی یہی دو قسمیں ہوتی ہیں، انسان یا طاقت پرست ہوتا ہے یا حق پرست
ہوتا ہے، انسان کی شرافت کا معیار یہی ہے جو طاقت کی پرستش کرنے والے ہیں، وہ انسانیت
سے گرے ہوئے ہیں جو حق کی پرستش کرنے والے ہیں جس حد تک حق کی پرستش کرتے ہیں تو

وہ اتنی ہی بلند انسانیت کے اوپر نظر آتے ہیں اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے لوگو میرا تم میں یہ آخری خطبہ ہے اس کے بعد میں تم سے نہیں مل سکوں گا اور اس کے بعد آپ نے وصیت فرمائی کہ اے لوگو میں دنیا میں تمہارے لئے دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ اب اس کے متعلق مختلف روائتیں ہیں، ایک روایت تو یہ ہے کہ میں اس دنیا کے اندر کتاب اور اپنی سنت چھوڑے جاتا ہوں اور ایک روایت یہ ہے کہ تمہاری ہدایت کے لئے کتاب اور اپنی عترت کو چھوڑے جاتا ہوں اور جب تک تم ان سے تمسک کرتے رہو گے تم گمراہ نہیں ہو گے، اب اس کو ذرا سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

عزیزانِ گرامی! پہلی پہلی بات جو ہے، پہلی پہلی روایت جو ہے تو وہ تو ایک کتاب کی ہے تو اس کو تو آپ اس طرح سے سمجھ لیں کہ کتاب ہدایت نہیں کرتی، کتاب والا ہدایت کرتا ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے وہ دوسروں کو سمجھا دیتا ہے ورنہ اگر کوئی سند نہ ہو، کوئی اتھارٹی (AUTHORITY) نہ ہو تو پھر اس کتاب کا مطلب جو تم سمجھنا چاہو تم سمجھ لو جو میں سمجھنا چاہوں وہ میں سمجھ لوں تو پھر سوائے اس تفرقے کے اور کوئی نتیجہ نہیں اور اس عقیدے کے ضمن میں کہ کتاب ہدایت کیلئے کافی ہے۔ میں ذرا آپ کو ایک اور بین تاریخی مثال دوں اور وہ یہ ہے کہ عزیزانِ گرامی امام حسین علیہ السلام کو جو قتل کرنے آئے تھے تو وہ کافر تو نہیں تھے، اللہ کو مانتے تھے، رسولؐ کو مانتے تھے، کتاب کو پڑھتے تھے، قرآن کو پڑھتے تھے، اس میں سے فتوے دیتے تھے لیکن اس کتاب کو ماننا اور اس کتاب میں سے فتوے دینا ان کو ظلم عظیم سے نہیں باز رکھ سکا، اس بات سے باز نہیں رکھ سکا کہ دنیا کا سب سے بڑا جو ظلم تھا یعنی امام حسین علیہ السلام کا قتل وہ اس کے مرتکب نہ ہوتے بلکہ اس کتاب سے انھوں نے فتوے حاصل کئے کہ معاذ اللہ خونِ حسینؑ حلال ہے۔ تو محض کتاب کی ہدایت تمھیں اس گمراہی کی منزل تک لے جانے سے باز نہیں رکھے گی اس لئے کہ کتاب کے متعلق جو میرا دماغ کام کرتا ہے وہ میں کروں اور جو تمھارا دماغ کام کرتا ہے تم کرو تمھارے پاس اپنی حجتیں اور دلیلیں ہیں، میرے پاس اپنی حجتیں اور دلیلیں ہیں۔ جب تک کتاب کی حقیقت کو ظاہر کرنے والا اس کے حقیقی مفہوم کو اجاگر کرنے اس پر نمونہ بن کے کوئی پیش ہونے والا نہ ہو تو اس ذات

تک اس کے معنی کس طریقے سے سمجھے جا سکتے ہیں تو اس طرح یہ کہنا کہ محض کتاب ہدایت کے لئے کافی ہے تو اس کے لئے کچھ تاریخی مصلحتیں تو ہو سکتی ہیں لیکن کوئی سند نہیں ہو سکتی۔
اب دو باتیں رہ گئیں، ایک وہ کہ آپ نے فرمایا کہ قرآن اور سنت، دوسری قرآن اور میری عترت، عزیزو بہتر یہ ہوتا ہے کہ ہم جو سیکھنے والے ہیں اور ہدایت حاصل کرنے والے ہیں تو بہتر یہ بات ہوتی ہے کہ مختلف حکائتیں جو ہم تک پہنچتی ہیں ان کے اندر کسی طرح سے تطبیق کی جائے بس یہ سمجھ لیں کہ سنت کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ سنت کے معنی عام طور سے حضورؐ کا قول، حضورؐ کا عمل، جن باتوں سے منع کیا، جن باتوں کی انھوں نے اجازت دی، جن باتوں کو انھوں نے چلنے دیا، یہ تمام کی تمام سنت کہلاتی ہیں۔ عزیزو! سنت حقیقت میں کہتے ہیں زندگی کے طریقے کو، ہم کہتے ہیں سنتِ جاہلیہ تو سنتِ جاہلیہ میں کس کے قول لکھے جاتے ہیں، کس کے عمل کو معیار ٹھہراتے ہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو قدریں عہدِ جاہلیہ کے اندر زندگی کے اوپر غالب تھیں ان کو ہم سنّتِ جاہلیہ کہتے ہیں جو جاہلیت کے اندر زندگی کا طریقہ تھا، زندگی کی قدریں تھیں ہم ان کو سنّتِ جاہلیہ کہتے ہیں، اور سنتِ رسولؐ سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اس زندگی کے طور طریقے کو ختم کر کے جو قدریں اب رائج کی گئیں اور اب غالب کی گئیں اور جو زندگی کا طریقہ اب بیان کیا گیا وہ سنتِ رسول اللہؐ ہے تو گویا پورے کا پورا زندگی کا طریقہ جس کے اندر قول بھی آجاتا ہے، عمل بھی آجاتا ہے، جس کے اندر زندگی بھی آجاتی ہے، جس کے اندر وہ قدریں کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عزیز تھیں ان کا احترام بھی آجاتا ہے۔ وہ تمام کی تمام سنت ہوتی ہے، سنت کے معنی ٹریڈیشن کے ہوتے ہیں، ایک آدمی سے سنت وابستہ نہیں ہوتی ہے، روایت تو بنتی ہی اسی وقت ہے جب ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچے تو اس وقت روایت بنا کرتی ہے، اس وقت وہ ٹریڈیشن بنا کرتی ہے، ایک آدمی کے لئے نہیں ہوتا کہ میری ٹریڈیشن یہ ہے جس وقت کہ ٹریڈیشن یا روایت کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک سلسلہ اور تسلسل چلا آرہا ہے اور اس کے آپ ماننے والے ہیں تو کوئی سنت جس کے اندر روایتوں کا یہ تسلسل نہ ہو۔

(اس کے بعد تقریر ٹیپ نہیں ہو سکی۔)

تیسری مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

تمام حمد اللہ کے لئے ہے جو مالک الملک ہے، ہر قسم کی حاکمیت اور مطلق حاکمیت اسی کی ہے، زمین میں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے اس پر اسی کی حاکمیت ہے، وہی مالک الملک ہے اور اس ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے، تمام خیر اسی کے ہاتھ میں ہے اور بیشک وہ ہر بات کے اوپر قادر ہے۔

اور میں درود بھیجتا ہوں محمد مصطفیٰؐ پر، جن کو اللہ نے ہدایت کے ساتھ اور دینِ حق کے ساتھ دنیا میں بھیجا اور اس لئے بھیجا کہ یہ دینِ حق تمام ادیانِ باطلہ پر غالب ہو، وہ ذاتِ گرامی جس کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ بے شک تمام عزتیں، ہمہ قسم کی عزت اللہ کے لئے ہے، رسولؐ کے لئے ہے اور اُن لوگوں کے لئے ہے جو اللہ اور رسولؐ کے اوپر ایمان لائے ہیں خواہ منافقوں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو، خواہ منافق اس حقیقت کو سمجھیں یا نہ سمجھیں، اللہ اور اُس کے ملائکہ نبیؐ کے اوپر دُرود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو تم بھی دُرود بھیجو۔

اور میرا سلام ہو محمد مصطفیٰؐ کی آل اور ان کے اہلبیتؑ کے اوپر جن سے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے ظاہری و باطنی رجس اور نجاست کو دُور رکھا اور جن کو پاکیزگی اور طہارت کی اس منزل کے اوپر رکھا جو اس طہارت اور پاکیزگی کے لائق ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ملک اور عزت سے سرفراز فرمایا ہے۔ لوگوں نے اس عارضی حکومت کو، اس آنی جانی حکومت کو جتنا ان سے دُور رکھا، اللہ تعالیٰ نے انسان اور انسانیت کے قلوب اور اذہان کے اوپر ان کی لازوال مملکت کو اتنا ہی زیادہ مستحکم کیا، اہلِ شقاوت نے اس گھر کی تحقیر کی جتنی سعی کی اور اُن کے مرتبے میں جتنی تخفیف کی کوشش کی اتنا ہی اس گھر کی منزلت و عظمت پر مہرِ تصدیق

ثبت ہوتی چلی گئی، ظلم کے ہاتھوں نے جتنی اس بات کی سعی کی کہ اس گھر کے چراغوں کو بجھایا جائے اتنا ہی مشکوٰۃِ عصمت پر نورِ لم یزل اور زیادہ روشن ہوتا چلا گیا، بیشک جس کو اللہ ملک اور عزت دینے والا ہے اس سے دنیا کی کوئی طاقت ملک اور عزت چھین نہیں سکتی بلکہ اس سے ملک اور عزت کو چھیننے کی کوشش کرنا گویا خدا سے جنگ کرنا ہے، اور جس نور کو اللہ نے روشن کیا اس کو ظلم کی آندھیاں بجھا نہیں سکتیں۔

عزیزانِ گرامی! ہم نے اپنی گزشتہ تقریروں میں اس بات کی کچھ جھلکیاں دیکھیں کہ کس طرح سے لوگوں کو نصیحتیں کی گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وصیت کہ جو عالمِ انسانیت کو کی گئی اس کے چند مقامات کو ہم نے دیکھا، اس کی چند جھلکیاں ہم نے دیکھیں، پھر اسی کی روشنی میں ہم نے یہ بات دیکھی کہ کس طرح اس ذکر اور نصیحت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ چلتا جا رہا ہے۔ عزیزانِ گرامی! ہم نے یہ بات بھی دیکھی کہ امامت کا مقام کیا ہوتا ہے، ہم نے یہ بات دیکھی کہ اپنے دل کے اوپر خواہ قیامتیں گزر جائیں لیکن امّت کا خیال، ملّتِ مسلمہ کا خیال، اپنے رسولؐ کی امت کا خیال، سب سے زیادہ بلند اور سب سے زیادہ ارفع رہتا ہے، کس طرح سے امام کا دل تڑپتا ہے، لوگوں کی گمراہی کے اوپر اور کس طرح سے اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ جتنے آدمی اس گمراہی سے بچ سکیں وہ بچ جائیں اور یہ سلسلہ ہدایت کا اور امر بالمعروف کا یہ مختلف زمانوں میں اور مختلف حالات میں مختلف امتحانوں میں سے گذرتا ہوا جاری رہا۔

امام حسین علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے ذکر کو بلند کیا اور اللہ تعالیٰ نے امام حسین علیہ السّلام کے ذکر کو بلند کیا اور اس ذکر کو بلند کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ واقعہ جو ایک صحرا میں پیش آیا تھا اس کے اوپر پردے نہیں ڈالے جا سکتے یہ شہادتِ جلی ہے یہ شہادتِ خفی نہیں ہے، اور شہادتِ جلی کی شان یہ ہوتی ہے کہ جتنی آدمی کوشش کرے اس کے مقصد کو چھپانے کی اس کو مٹانے کی وہ اور زیادہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے جتنی کوشش اس بات کی کرے کہ لوگوں کی نگاہوں میں اس شہادت کی عزت کم ہو جائے اس کی تحقیر ہوا تنی ہی زیادہ اس کی عزت بلند ہوتی جاتی ہے مَکَرُوا وَمَکَرَ اللّٰہ لوگ ایک مکر کرتے ہیں، لوگ ایک

تدبیر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی تدبیر میں سے اپنی تدبیر پیدا کر دیتا ہے، آج اسی کو ایک منزل آگے بڑھا کر ہم کچھ جھلکیاں، کچھ باتیں کہ جو بازارِ کوفہ کے اندر ہوئیں جو دربارِ ابنِ زیاد میں ہوئیں، جو دربارِ شام میں ہوئیں اس کے چند مقامات محض چند مقامات ان کو ذرا سمجھنے کی اور سمجھانے کی کوشش کریں۔

عزیزانِ گرامی! آپ نے اکثر پڑھا ہے کہ بازارِ کوفہ میں جب یہ قافلہ اہلبیتؑ کا جارہا تھا اور کس شان سے جارہا تھا میری زبان میں اتنی طاقت نہیں کہ میں اس تجمل کو اور اس شان کو بیان کرسکوں کہ جس شان سے یہ کاروانِ حق بازارِ کوفہ کے اندر نکل رہا تھا لوگ مرد و زن تماشے کے لیے جمع تھے وہ خطبہ آپ کے سامنے ہے جو جنابِ زینبؑ نے اس وقت ارشاد فرمایا جو جناب فاطمہ بنتِ حسینؑ نے خطبہ دیا، بی بی زینبؑ اس مقام پر کوفہ والوں کو مخاطب کر کے فرماتی ہیں کہ کوفہ والو تم سوچو کہ تم نے کیا کیا، تمھاری حالت تو اس عورت کی سی ہے کہ جس نے سوت کاتا ہو مضبوط کاتا ہو اور پھر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو اور تمھاری تمثیل تو ایسی ہے جیسے کوڑی کے اوپر گھاس اُگی ہوئی ہو یا جیسے کوئی کسی گناہگار کی قبر ہو اور چاندی کا خول اس کے اوپر چڑھا ہو۔ یہ جنابِ سیدہ زینبؑ کا ارشاد ہے، میں یہیں رُکتا ہوں۔ عزیزو! یہ بات ایک عورت کے سُوت کاتنے کی، مضبوط کاتنے کی اور پھر اس کو توڑ دینے کی، یہ کلامِ پاک کی آیت ہے اور ذرا اس کا موقعہ بھی دیکھو اور وہ موقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے عدل کا احسان کا، ایتائے ذی القربیٰ کا اور تمھیں منع کرتا ہے فحشاء سے منکر سے اور بغی سے گویا کہ تمام کے تمام معاشرت کے اصول کو ان چند الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے بیان کر دیا ہے، ہم اس کی تفصیل و تشریح میں نہیں جاتے ایک محض بغی کے لفظ کو وہ بھی ضمناً بیان کرتے ہیں۔ بغی کے معنی بغاوت یا سرکشی کے ہوتے ہیں اور بغی اور عصیان اور سرکشی وہ اسی کے خلاف ہوسکتی ہے کہ جو حاکمِ مطلق ہوتا ہے تو بغاوت کے معنی ہوئے اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کرنا، اب مجھے تم یہ بات بتاؤ کہ کیا وہ شخص کہ جو اللہ کے قانون کے لئے اور اللہ کے دین کے لئے کھڑا ہو اور کسی ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق بیان کرے۔

اور یہ بات کہے کہ تمھاری حکومت غصب کی ہوئی ہے اور یہ بات کہے کہ تم ظلم و جور سے حکومت کرتے ہو تو کیا کسی معنیٰ میں اسلامی اصطلاح کے کسی معنیٰ میں کیا وہ باغی کہلایا جاسکتا ہے؟ باغی وہ ہے کہ جو اللہ کا باغی ہو، مطیع بندہ اور فرمانبردار بندہ اور وفادار بندہ وہ ہے کہ جس کا اپنے اللہ سے عہد قائم ہے، باغی بندہ وہ ہے کہ جو اپنے اللہ سے اس عہد کو توڑ چکا، تو اللہ تعالیٰ تمھیں بغی سے، سرکشی سے منع کرتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کہتا ہے اور خدا تمھیں نصیحت کرتا ہے، شاید کہ تم نصیحت پا جاؤ، اور پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے اور اے لوگو! اللہ تعالیٰ سے اپنا عہد کرنے کے بعد اس عہد کو پورا کرو اور اللہ تعالیٰ سے ہمارا کیا عہد ہے؟ اللہ تعالیٰ سے ہمارا ایک تو یہ عہد ہے کہ سوائے اللہ کے اور کوئی اللہ نہیں ہے، اور دوسرا ہمارا یہ عہد ہے کہ ہم تیری ہی اطاعت کرنے والے ہیں، تیری ہی عبادت کرنے والے ہیں، تو نے جو حکم دیا ہے ہم اسی کو ماننے والے ہیں، اور پہلی قرآنی آیت کے اندر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے عدل کا احسان کا، ایتائے ذی القربیٰ کا، اور تمھیں منع کرتا ہے فحشا سے، منکر سے، بغی سے، گویا یہ ہمارا عہد ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا حکم مانیں گے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے، عبادت کے اندر یہی باتیں شامل ہوتی ہیں۔

عبادت کے اندر پہلا جز و حمد کا ہوتا ہے، حمد نعمتوں کا شکریہ بھی ہے، اور حمد حقیقت کا اعتراف بھی ہے، دوسرا جز و عبادت کے اندر تذلیل اور خشوع کا ہوتا ہے، یعنی اپنے آپ کو پست دکھانا اور اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور اس کے رب اعلیٰ ہونے اور اور اس کے ارفع ہونے کا اقرار کرنا جس کی صورت سجدہ ہے اور تیسرا حصّہ اس کے حکم کی اطاعت کرنے کا ہوتا ہے، اپنے معاملات کے اندر وہ بات کرنا اور اس طریقے سے اپنی معیشت کو بسر کرنا اور معاشرت میں بسر کرنا کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ یہ تین جزء ہوتے ہیں عبادت کے، اور ہمارا ایک معاہدہ COMMITTMENT ہے یعنی اسلام کو قبول کرنا ایک عہد ہے کہ جو بندہ اپنے رب سے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اے لوگو!

جب تم اپنے خدا سے عہد کر چکے تو اس عہد کو پورا کرو اور اپنی قسموں کو مت توڑو جس کو تم مضبوط کر چکے ہو اور جس کی ضمانت خود خدا دے چکا ہے تو گویا یہ وہ قسمیں ہوئیں کہ جو اس عہد کے ماتحت لی جاتی ہیں اور یہی وہ بیعت ہوئی جو رسولؐ کے یا امامؑ کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور وہ بیعت اس لئے کی جاتی ہے تاکہ وہ عہد کہ جو ہم نے اللہ تعالیٰ سے کر رکھا ہے اس عہد کو پورا کر سکیں، تو گویا یہ وہ بیعت ہے جو رسولؐ اور امامؑ سے ہوتی ہے، یعنی رسولؐ اور امامؑ کے ہاتھ پر بیعت اس عہد کا نتیجہ ہے جو بندے نے اپنے اللہ سے کیا ہے۔

وہ اس لئے کہ ہم نے جو اپنے اللہ سے عہد کیا ہے ایک حقیقت کے اعتراف کا، ایک حکم کی اطاعت کا تو اس کے تقاضوں کو ہم پورا کر سکیں تو جس وقت تم نے اپنی قسموں کو مضبوط کر لیا، تو پھر ان قسموں کا ضامن خود خدا ہے، ان کا کفیل خود خدا ہے، اسی کو وکیل سمجھو اس لئے کہ شاہد بھی وہی ہے، کفیل بھی وہی ہے۔

تو جس وقت تم نے یہ قسم کھائی، یہ وفاداری کا عہد استوار کیا تو خود اللہ تعالیٰ ضمانت لیتا ہے اس کو پورا کرنے کی اس راستے کے اندر کچھ مشکلیں پڑتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اور دیکھو اس عورت کی طرح مت ہو جانا کہ جس نے مضبوط سوت کاتا اور پھر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ضمانت لی ہے اس کے اوپر یقین رکھنا صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ کام لینا بالآخر کامیاب تم ہی ہو گے، یہ مت کرنا کہ دنیا کے خوف سے یا دنیا کے لالچ میں آکر تم اس قسم کو توڑ دو کہ جو تم نے اللہ کے رسولؐ سے اور اللہ کے امامؑ کے ساتھ لی ہے اور جو قسم اس لئے لی ہے کہ تم اس عہد کو پورا کر سکو جو تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے مابین ہے، تو اس عورت کی طرح سے مت ہو جانا جو سُوت کو مضبوط کات کے خود ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے اور پھر دوسری قسموں کا ذکر کیا اور اپنی قسموں کو تم اپنی مکر کی ڈھال مت بنانا اس لئے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے برتر ہو سکے، یہ سب تمہارے امتحان ہیں اور اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تم کو بتلا دے گا کہ تم کن کن باتوں میں اختلاف کرتے تھے۔

تو عزیزانِ گرامی! یہ قسمیں دو طرح کی ہوئیں ایک تو یہ ہوا کہ جو بندہ اپنے رب سے

کے ہاتھ پر اس وجہ سے بیعت کرتا ہے کہ جو عہد اس کے اور اللہ تعالیٰ کے مابین ہے اسکو پورا کرسکے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرسکے۔ اور دوسری قسم ایسی ہوئی کہ لوگوں کا گروہ، دوسرے لوگوں کا گروہ، تیسرے لوگوں کا گروہ، اور یہ سب گروہ طاقت اور اقتدار کے بھوکے اور یہ طاقت اور اقتدار کے اوپر آپس میں لڑنے کے لئے، تاکہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے اوپر طاقت اور اقتدار میں غلبہ حاصل کرسکے تو اس مقصد کے لئے قسم کھائی جاتی ہے اور اس قسم کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ہم تم باہم وفادار رہیں گے۔ ہم آپس میں مل کے اس دوسرے گروہ کو شکست دیں گے اور اس کے اوپر برتری حاصل کرلیں گے۔ تو گویا یہ مختلف نوعیت کی قسمیں اور یہ دو عہد ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے کلام پاک کے اندر ذکر کیا ہے، جناب سیّدہ زینبؑ انھیں قسموں کو یاد دلارہی ہیں کہ اے کوفے والو تم نے کس کا عہد توڑا اور کس سے عہد کیا ہے اور کون سا عہد ہے تمھارا جس عہد کے ذریعہ سے تم اس وعدہ اور عہد کو پورا کرسکتے تھے کہ جو اللہ اور تمھارے مابین ہے اسے تو تم نے توڑ دیا اور یہ جو تم نے قسم کھائی ہے جس کو تم اپنے مکر کی ڈھال بنارہے ہو جس کے لئے کہ تم یہ بات کہتے ہو، میں اس کو اور ذرا واضح بات کر کے کہوں جس کے لئے کہ تم یہ بات کہتے ہو کہ کیا کریں ہم تو فلاں فوج کے اندر ہیں ہیں تو پیسے اس بات کے ملتے ہیں کہ جو کچھ بھی حاکم حکم دیتا ہے تو ہم وہ بات کرتے ہیں تو یہ جو تم باتیں کرتے ہو اور یہ جو تم نے قسمیں کھائی ہیں اور یہ عہد جو تم نے کیا ہے اس لئے کہ ایک گروہ کی دوسرے گروہ کے اوپر برتری ہو، تو تم یہ سوچو کہ تم نے حبل اللہ کو تو چھوڑ دیا، اللہ کی رسی کو تو چھوڑ دیا، اس کو مضبوط بننے کے بعد اس کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا، اب ان قسموں کو تم اپنی ڈھال بنائے پھرتے ہو اپنے نفس کی، اپنے مکر کی اور اپنی شیطنت کی ڈھال، تو اسی طرف اشارہ کیا ہے جناب زینبؑ نے، اور پھر آپ نے فرمایا ہے کہ اے کوفے والو تم روؤ اور خوب روؤ اس لئے کہ تم نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ یہ کہ تم نے صحیح ہادی کو چھوڑ دیا اور اب تم ظالموں کے غلام بنے ہو اور اب تم دیکھو کہ اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ تو یہ ایک موقع ہے جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہورہا ہے اور یہ اس وقت ہورہا ہے

جبکہ تمام کے تمام لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے آرہے ہیں اور میری بی بی آنکھوں سے پردہ اٹھا رہی ہے۔

اب آگے کے جو مقامات ہیں تو اُن کے متعلق میں تمہیدی طور پر کچھ بیان کروں کہ یہ کیا صورت تھی اور حکومت کا مقام دین کے اندر ہے کیا؟ ایک تاریخی حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو ملک دیا، بادشاہت وحکومت دی ملک ہم یہاں ظاہری معنوں کے اندر لے رہے ہیں، اس کو ایسا سمجھو کہ جس وقت لوگوں کے قلوب اور اذہان کے اندر انقلاب ہوتا ہے اور ان کے عمل کی صلاحیتیں جاگتی ہیں جس وقت کہ ملت کی تاسیس ہوتی ہے نبی کے ہاتھوں، تو اللہ تعالیٰ انعام کے طور پر یہ حکومت بھی دیدیا کرتا ہے، چنانچہ بنی اسرائیل کا جہاں ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں کہ جو بنی اسرائیل کے اوپر تھیں، اس کا جس جگہ ذکر ہے تو وہاں خاص طور پر یہ بتایا گیا کہ تمھارے اندر بڑے بڑے بادشاہ ہوئے، بڑے بڑے انبیاء ہوئے، گویا انبیاء کا ہونا، بادشاہ کا ہونا کسی قوم کے اوپر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نشانی ہے، اور حضورؐ کو یہ حکومت جو دی گئی تو شاید اس وجہ سے دی گئی کہ ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ نیکی اور طاقت میں جو تضاد نظر آتا ہے تو اصل میں نیکی اور طاقت میں تضاد نہیں ہوتا بلکہ نیکی کے ذریعے سے طاقت بھی آتی ہے اور اس طاقت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس نیکی کو اور زیادہ پھیلایا جائے تو گویا پہلی اور تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کو حکومت ملی، اس میں ایک مغالطہ کو رفع کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ کسی جگہ کلام پاک کے اندر یہ نہیں آیا کہ ہم نے اپنے اس رسولؐ کو بھیجا ہے تاکہ وہ حکومت قائم کرے، بادشاہت قائم کرے بلکہ رسول کے متعلق یہ کہا گیا کہ یہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے، یہ تزکیۂ نفس کرتا ہے، یہ تزکیۂ قلب کرتا ہے، یہ علم اور کتاب اور حکمت کی تعلیم کرتا ہے، مقاصد نبوت کے اندر حکومت کا قائم کرنا کسی جگہ نظر نہیں آتا، ہاں حکومت اللہ کا انعام ہے اور عزیزو جس طرح سختیاں امتحان ہوتی ہیں اسی طرح سے انعام بھی امتحان ہوا کرتے ہیں، اب ہوا یہ کہ چونکہ وہ حکومت قائم ہوئی تو تمام تر نگاہیں اس حکومت کے اوپر ہوگئیں تو گویا اسلام

کی نشانی اور اسلام کی علامت وہ حکومت بن گئی، اب جو اس حکومت کا سربراہ ہوا وہ خلیفۃ اللہ کہلایا، وہ خلیفۃ الرسول کہلایا، تو گویا خلیفۃ الرسول کی تعریف یہ نہیں ہوئی کہ جو آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے، جو آیتیں تلاوت ہو چکی ہیں ان آیتوں کو دہرائے، آیتیں لوگوں کو سمجھائے، تزکیۂ قلب کرے، تزکیۂ نفس کرے، علم لوگوں تک پہنچائے، کتاب و حکمت کی تعلیم دے تو وہ خلیفۃ الرسولؐ ہے بلکہ خلیفۃ الرسولؐ کی تعریف یہ ہوئی کہ جو اس ملک کا سربراہ ہو اس کو خلیفۃ اللہ سمجھ لو، خلیفۃ الرسولؐ سمجھ لو، اس کو امیر المومنین سمجھ لو، جو تمھارے جی میں آئے وہ نام دے لو بہرحال وہی سب سے بڑا مرکز اسلام کا ہو گیا، میں بڑا حیران ہوں کہ اگر حکومت حاصل نہ ہوتی اس لئے کہ حکومت نبوت کا لازمی جزو تو نہیں ہے، تو پھر خلیفۃ اللہ یا خلیفۃ الرسولؐ کی کیا شان ہوتی یا اس کی کیا تعریف ہوتی، لیکن اب تو یہ حکومت سامنے ہے اور یہ بات بھی جا رہی ہے کہ یہ شخص جو حاکم ہو گیا عام اس سے کہ وہ کس طرح حاکم ہوا یعنی خلافت بہ استیلا ربھی تو ہوتی ہے یعنی زبردستی بھی تو خلافت ہوتی ہے، سیاست کی وجہ سے بھی تو خلافت حاصل کی جا سکتی ہے نامزدگی سے نسلاً بعد نسلٍ اس سے بھی تو خلافت چلتی ہے تو خواہ کسی طرح سے حاکم ہو گیا ہو اسے خلیفہ مان لو، یہاں ایک بات اور میں کہوں کہ جب تک وہ حکومت کا سربراہ نہیں ہوا تھا اور حکومت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس وقت تو وہ باغی تھا اس لئے کہ اب بغاوت کے معنی اللہ کے خلاف بغاوت کے نہیں ہوئے اور جس وقت کہ اس کو وہ حکومت حاصل ہو گئی تو پھر وہ خلیفۃ اللہ اور خلیفۃ الرسولؐ اللہ ہو گیا، اور جس وقت یہ ہوا تو اس وقت وہ صاحبِ امر ہو گیا، صاحب الامر ہو گیا تو امر اس کے ہاتھ میں آ گیا، اب ایک طرف ہم یہ بات یہ کہتے ہیں کہ تمام خلق اور امر اللہ کے لئے ہے تو جس کے پاس امر ہے، جس کے پاس کوئی چیز ہے وہی دوسرے کو دی جا سکتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے لئے تمام امر ہے، اللہ تعالیٰ کے اذن سے رسولؐ کے پاس امر ہے، اللہ تعالیٰ کے اذن سے اور اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے اذن سے اگر مامور کیا ہو تو وہ اولو الامر ہے، لیکن ہوا یہ کہ جو بھی کسی طرح سے حکومت کا سربراہ بن گیا وہ اولی الامر بن گیا۔

وہ اولی الامر کہا گیا۔ پھر یہ بات کہی گئی کہ دیکھو کیا قرآن شریف کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ لوگو اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور اولی الامر کی، بلکہ آگے چل کر توضیح یہ بھی کی گئی کہ اگر تمھارے مابین کسی قسم کا تنازعہ ہو تو اللہ اور رسولؐ کی طرف رد کردو اس کا مطلب یہ کہا گیا کہ تمھارے اندر جو کچھ بھی مناقشات ہو تو اللہ اور اس کے رسولؐ پر چھوڑ دو تمھارا کام تو یہ ہے کہ تم اطاعت کئے چلے جاؤ تو ایسی صورت میں اب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے دبتے چلے جاتے ہیں بلکہ یہ بات بتائی جارہی ہے کہ اسلامی تعلیم تو یہ ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کرو اور پھر اس سے آگے کیا کچھ ہوا، اس سے آگے یہ ہوا کہ اسلام کا تمام کارنامہ ملکوں کو فتح کرنا اور سلطنت کو قائم کرنا سمجھا جانے لگا، چنانچہ آج بھی آپ کو ایسے بہت سارے حضرات مل جائیں گے کہ جو اسلام کی جس وقت تعریف کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ اسلام نے کیا معجزے دکھائے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ جناب والا اسی اسلام کا نتیجہ تھا کہ ایک ایک دن میں نو نو شہر اور قریئے فتح کئے گئے تو گویا اسلام کا کارنامہ یہ بنا، یہ حکومت اسلام کی صداقت کی دلیل ٹھہری، اور آگے چل کر یوں سمجھو کہ اسلام کی خدمت کی صورت یہ رہی کہ اس ملک کی، اس حکومت کی جتنی آپ توسیع کرتے ہیں اتنی ہی اسلام کی خدمت ہو رہی ہے، اور آگے چل کے یہ ہے کہ اب عزت کا معیار اقتدار ٹھہرا جو حکومت کے اوپر بیٹھا ہوا ہے، جو کرسی پر قابض ہے اس کی عزت ہے، اور جو رسن بستہ سامنے کھڑا ہوا ہے تو اُس کے لئے عزت نہیں ہے، اس کو حقارت کے ساتھ دیکھا جائے گا، اس کو ذلیل کیا جائے گا۔

اس طرح کے حالات خیالات کو بھی مسخ کر دیتے ہیں، اب جو مکتبِ خیال پیدا ہوئے تو وہ مرجیہ اور جبریہ تھے، اب یہ بات چلی کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ ٹھیک کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ بات کی اگر اللہ تعالیٰ یہ بات نہ کرتا تو فلاں آدمی کیوں حکومت کے اوپر بیٹھا ہوا ہے، اب آخر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تو کوئی بات نہیں ہوا کرتی، اور مرجیہ کے اندر یہ ہے تم کسی کو کیوں بُرا کہتے ہو، رہی اللہ تعالیٰ کے عدل کی بات تو ٹھیک ہے ہاں وہ بڑا رحمٰن ہے اور رحیم ہے جسے چاہے وہ بخش دے، کتاب کے اندر لکھا ہوا ہے کہ

جس کو چاہے وہ بخش دے تو وہ بخش دے گا تو اس لئے کسی ظالم کو ظالم مت کہو تو یہ
گویا اس حکومت کا لازمی فلسفہ تھا جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی، تو اس حکومت کا
فلسفہ یہ ہوا کہ ظالم کو بُرا نہ کہا جائے، اپنے JUDGEMENT اپنی رائے کو بالکل
بند رکھا جائے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اس کی بخشش کی کوئی انتہا نہیں ہے
اور جو کچھ بھی ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کرتا ہے تو اس کے
اوپر کسی کو اعتراض کی کیا گنجائش ہے، جب کوئی بادشاہ ہو گیا، جب کوئی خلیفہ
ہو گیا تو اولی الامر ہو گیا، اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے تو اس قسم کے مکتبِ خیال
جو تھے تو وہ پیدا ہوئے۔ اب اس موقع کے اوپر مجھے محض ایک بات عرض کرنی ہے،
یہ خرابی جو ہے تو وہ اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ مشیّتِ الٰہی کے اور رضائے الٰہی کے مفہوم
میں تلبیس کی جاتی ہے، ایک تو اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہوتی ہے اور ایک اللہ تعالیٰ کی رضا
ہوتی ہے، اس کی مشیت میں تو کسی کو دخل نہیں، اللہ تعالیٰ اپنی جو کچھ بھی تدبیر امور
کرتا ہے جو اس کی مشیّت ہوتی ہے، اس میں مجھ سے آپ سے مشورہ نہیں لیا کرتا، تو اللہ
تعالیٰ کی مشیت کے اندر تو کسی کو دخل نہیں اس کی مشیت تو آپ مانیں یا نہ مانیں وہ
آپ کے اوپر چلے گی، لیکن ایک چیز ہے اس کی رضا یعنی کن باتوں سے وہ خوش ہوتا ہے
ہم سے یہ نہیں کہا گیا کہ ہم اس کی مشیت کے اندر دخل دیں بلکہ ہم سے یہ بات کہی گئی ہے
کہ دیکھو اللہ تعالیٰ ان باتوں سے خوش ہوتا ہے اور ان باتوں سے ناراض ہوتا ہے مشیّت
اللہ تعالیٰ کی ہے، بے شک جو وہ چاہے کرے اور جو وہ چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ اس کی
مشیّت کے اندر کون روڑا اٹکا سکتا ہے، کون سوال کر سکتا ہے۔ مسئول تو ہم ہیں
سوال تو ہم سے کیا جائے گا اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کیا جاتا، ہم سے جو سوال کیا
جائے گا وہ اس بات کے اوپر کیا جائے گا کہ جو کچھ بھی تقدیر تھی اور جو کچھ بھی مقدر
تھا اس کو تو اب اللہ تعالیٰ جانے لیکن تمہیں جو امر کیا گیا تھا، تمہیں جو حکم دیا گیا تھا
اس کو بھی تم پورا کرتے تھے یا نہیں، تم نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ تم اللہ تعالیٰ کی
رضا حاصل کر سکو، اللہ تعالیٰ کی مشیّت جو ہے اس کو چھوڑیں وہ بہت بڑی چیز ہے،

بندے کا کام جو ہے تو یہ ہے کہ رضائے الہٰی کے حصول کی سعی کرے اور سزا و جزا کا معیار بھی یہی ہے، مشیت کا کیا ذکر ہے اس میں کسی کو کیا دخل، یہاں تو اللہ تعالیٰ کے رضا کی بات ہو رہی ہے تو مشیت اور رضا کے متعلق غلط فہمی لوگوں کے دل کے اندر پیدا کی گئی اور یہ بنیادی غلط فہمی تھی جواب تک موجود ہے۔

اور عزیزانِ گرامی! میں آپ سے عرض کروں اس معاملے میں یہ بات آپ دیکھیں، آج تمام قوموں کا ہمارے اوپر اس بات پر اعتراض ہے کہ یہ مسلمان قوم تقدیر کو ماننے والی ہے اس لئے ان کے تمام قوائے عمل سست ہو گئے ہیں، شل ہو گئے ہیں۔ عزیزو! جس وقت کہ قومیں گرا کرتی ہیں تو اس وقت انکے تخیلات بھی بدل جاتے ہیں، ان کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ ہم سے یہ بات کہی گئی کہ جو کچھ بھی مقدر ہے اور جو کچھ بھی تقدیر ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے تو تم ان نتائج سے بے پروا ہو کے کہ تمھیں اس میں کامیابی ہوگی کہ ناکامی ہوگی جو کچھ تمھارا فرض ہے اس کو پورا کرتے رہو، جو کچھ تمھیں حکم دیا گیا ہے تو میں آپ سے یہ بات عرض کروں کہ اس سے زیادہ عمل کے اندر کون مستحکم ہو سکتا ہے کہ جس کو فرض سے کام ہے اور جس کی نظر محض اپنے فرض کی ادائیگی کے اوپر ہے اور جو نتائج سے بالکل بے پروا ہے اور نتائج کو تمام اللہ کے اوپر چھوڑتا ہے، جو تقدیر کو ماننے والا ہے تو اس سے زیادہ تو عمل کے اندر کوئی چاق و چوبند نہیں ہے، اس سے زیادہ تو اور کسی کا عمل مؤثر نہیں ہو سکتا لیکن یہ ایک ملت کے زوال کی بات ہے کہ وہی بات الٹی ہو جاتی ہے، اور ایک بات میں اسی میں ضمناً عرض کروں کہ عزیزانِ گرامی میں نے یہ بھی اپنے کان سے سنا ہے کہ ہمارے امامؑ کا ظہور اس وقت ہوگا کہ جس وقت دنیا فسق و فجور سے بھر جائے گی تو اس حقیقت کو اس بات کا جواز ٹھہرانا کہ عمل کرنے سے کیا فائدہ وہ تو یہ کہہ دیا گیا ہے کہ دنیا ... ... اگر دنیا فسق و فجور سے نہیں بھرے گی تو امامؑ کا ظہور کیسے ہوگا! آگے میں نے یہ نہیں سنا کسی کے منہ سے کہ وہ یہ بات کہے کہ امامؑ کا جلدی ظہور کسی طرح سے ہو۔ ہم تو دعائیں مانگتے

ہیں اپنے سلام کے اندر کہتے ہیں اور امامؑ کا ظہور اس وقت ہوگا جب فسق و فجور دنیا کے اندر زیادہ پھیلے، اس لئے ہمارا دینی فریضہ یہ ہے کہ فسق و فجور دنیا کے اندر پھیلائیں۔ ہاں اسی بات کی تو کسر رہ گئی لیکن اس بات تک تو آگئے ہیں کہ صاحب یہ فسق و فجور تو ہو گئے اب کیا کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے اور ہمارے رسولؐ نے کہہ دیا ہے اور حدیث میں آگیا ہے کہ دنیا جب فسق و فجور سے بھر جائے گی تو اُس وقت امامؑ کا ظہور ہوگا۔

عزیزانِ گرامی! میں محض ایک بات عرض کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جس وقت کسی مہمان کا انتظار کیا جاتا ہے تو اُس کے لئے تیاری کی جاتی ہے۔ اگر یہ تیاری نہیں ہے تو مہمان کی آمد کا انتظار کس طرح کیا جا رہا ہے۔ انتظار تو ہمارا اس وقت معتبر ہوتا جب ہم اپنے گھر کو اچھی طرح سے سجاتے بناتے اور ہم اپنے گھر کو روشن رکھتے اس لئے کہ معلوم نہیں وہ مہمانِ گرامی رات کے اندھیرے میں آئے اور وہ کھٹکھٹائے اور ہم اس وقت سوتے ہوئے پڑے ہوں اور گھر کے دروازے ہمارے کھلے نہ ہوں، چراغ ہمارے روشن نہ ہوں، مہمانداری کی کوئی تیاری نہ ہو، اور مجھے کیا معلوم کہ میرا امامؑ آیا ہو اور دیکھا ہو کہ لوگ پڑے سو رہے ہیں غفلت کے اندر اور کسی گھر کے اندر چراغ نہیں جل رہا ہے اور کوئی دروازہ نہیں کھلا ہوا ہے تو آسمان کی طرف دیکھ کے پھر پردۂ غیبت میں چلا گیا ہو۔ بجائے اس بات کے کہ اس انتظار کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم اپنے گھر کو اس طرح تیار رکھتے کہ وہ مہمان کل ہی آجائے، گویا وہ مہمان اسی ساعت میں آجائے تو کیا وہ یہ نہ دیکھے گا کہ اس کے لئے کیا تیاری کی جا رہی ہے تو عزیزانِ گرامی! تو اس طریقے سے وہ تصورات کہ جو زندگی سے بھرے ہوتے ہیں وہ تصورات بگڑ جاتے ہیں ان سے عمل جو ہے تو وہ بگڑ جاتا ہے۔ یہ تمام کا تمام معنی میں تحریف اور عقیدوں میں فساد جو شروع ہوا اور جو شروع کیا گیا بادشاہت کی وجہ سے اور جس کو اور زیادہ ترغیب دی گئی۔ اور زیادہ مربوط کیا گیا ان لوگوں کے ذریعے سے کہ جن کو اس بات کے اندر فائدہ تھا، جن کا اسی بات کے اندر کوئی مفاد تھا انھوں نے اور زیادہ اس بات کو محفوظ کر لیا تو

یہ ایک صورت جو تھی تو وہ پیدا ہوئی۔

اب اسی روشنی کے اندر آپ یہ دیکھیں کہ ابنِ زیاد جناب سیدہ زینبؑ سے کہتا ہے کہ تم نے دیکھا کہ اللہ نے تمھارے خاندان کو رسوا کیا اور تمھارے جھوٹ کا پول کھل گیا۔ کیوں، اس وجہ سے کہ اس کا معیار وہی ہے جس معیار کو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا۔ اس غلط معیار کی تردید میں جناب سیدہ زینبؑ اس وقت اس حقیقت کو آشکار کرتی ہیں کہ ابن زیاد اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجہ سے عزت دی۔ اب یاد کرو عزیزو! کہ عزت اللہ کے لئے ہے، عزت اللہ کے رسولؐ کے لئے ہے اور اُن لوگوں کے لئے ہے جو اللہ کے رسولؐ کے اوپر ایمان لانے والے ہیں اور اس کے علاوہ کہیں تمھیں عزت نہ ملے گی تو بی بی زینبؑ نے یہی کہا کہ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجہ سے ہماری عزت بڑھائی اور رسوا، رسوا تو وہ ہوتا ہے کہ جو فاسق و فاجر ہو تو یہ وہی بات ہے کہ تمھارے اندر سب سے زیادہ معزز وہ ہے، کہ جو تقویٰ کے اندر بڑا ہے، کوئی فسق، کوئی گناہ کی بات، کوئی برائی کی بات، کوئی ذلیل بات جو کرے گا وہ رسوا ہوا کرتا ہے اور جھوٹ جھوٹ تو اس کا کھلا کرتا ہے جس کا حق سے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو تو اس پر جھوٹ کی تہمت لگا رہا ہے کہ جس نے حق کو اتنی مضبوطی کے ساتھ پکڑا جس نے حق کا اس طرح سے اعلان کیا ہو کہ جو خود حق بن گیا ہو، اور پھر ابنِ زیاد نے یہ بات کہی، اور دیکھو کہ تمھارے خاندان کو کس طرح سے اللہ نے تباہ کیا، تم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا کیا۔ اور جناب زینبؑ نے اس کے اوپر فرمایا کہ میں تو اچھائی ہی اچھائی دیکھتی ہوں، شہادت ان کے مقدر میں تھی۔ مقدر کے یہ معنی ہوئے، تقدیر کے یہ معنی ہوئے۔ شہادت ان کے مقدر میں تھی اور وہ برضا و رغبت اپنی قتل گاہ کی طرف گئے اور عنقریب وہ وقت بھی ہوگا کہ تم اور وہ ایک ہی انصاف کرنے والے کے سامنے کھڑے ہوں گے اور وہ بات جو ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی اللہ کرتا ہے تو وہ ہوتا ہے۔ تو عزیزو وہ بھی بعد میں آیا اور ابنِ زیاد نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ انھوں نے کہا یہ علی ابن الحسینؑ ہیں، کہا کیا علی ابن الحسینؑ کو اللہ نے نہیں مارا؟ اللہ نے

نہیں قتل کیا۔ عزیزو! امامؑ نے فرمایا کہ وہ میرا چھوٹا بھائی تھا، اس کا بھی نام علیؑ تھا وہ تھا علی ابن الحسینؑ اس کو لوگوں نے مار دیا۔ اب وہ ابنِ زیاد کہ جس نے قتل کرنے کیلئے لوگوں کو بھیجا تھا تو وہ ابنِ زیاد اس بات پر کہتا ہے کہ نہیں خدا نے مارا اللہ نے مارا، اور امامِ عالی مقام نے کلامِ پاک کی دو آیتیں تلاوت کر کے کہ اور مرتے وقت اللہ ہی ہے کہ روحوں کو اپنے پاس بلا لیتا ہے اور بغیر اُس کے علم کے کوئی نہیں مرتا، اس بات کو، اس مباحثے کو ختم کر دیا تو یہ دو تصویریں ہیں، یہ دو تصویریں آپ کے سامنے چل رہی ہیں، ایک گمراہی وضلالت کی اور دوسری ہدایت کی تصویر۔

دربارِ یزید کے اندر یزید درباریوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ انھوں نے ہمارے ساتھ قطعِ رحم کیا، کیا انھوں نے یہ نہیں پڑھا تھا کہ اللّٰھُمَّ ملك الملك تؤتی الملك مَن تشاء وتنزع الملك ممن تشاء، امام حسین علیہ السلام کے لئے یہ بات کہی جا رہی ہے۔ عزیزو! اس بات کو بھی اچھی طرح سے دیکھ لو۔ اس کے اندر یہ ہے کہ بیدك الخیر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کے اندر تمام کی تمام بھلائیاں ہیں۔ اے طاقت کے بھوکو، اے طاقت کے پرستارو، اس طاقت کے پیچھے اس طرح سے مت جاؤ، یہ طاقت آنی جانی چیز ہے اگر تمھیں خیر طلب کرنا ہو تو اللہ سے طلب کرو، تم اللہ کی عبادت کرو، تم اللہ کی ملازمت اور خدمت کرو اور اللہ تعالیٰ انعامات دے گا، یہ حکومت کیا وہ حکومتیں تم کو دے گا کہ جن کو کبھی زوال نہیں ہوگا مگر یہ مت کرنا کہ تم ان چیزوں کے پیچھے دوڑو اس لئے کہ ان چیزوں کے پیچھے جب تم دوڑو گے تو وہ اللہ تعالیٰ کی مملکت کے اندر غصب ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے جو چیز لی جاتی ہے وہ جائز چیز ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کو ایک طرف کر کے اس پر جب جھپٹا مارا جاتا ہے، وہ غصب ہے، اسی کو غصب کہا کرتے ہیں اور اگر یہ پوچھو کہ اللہ تعالیٰ غصب کی اجازت کیوں دیتا ہے اس لئے کہ وہ تو تمام کا تمام مالک الملک ہے جو چاہے کرے۔ تو عزیزو اس کا جواب جو ہے تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو کیوں پیدا کر رکھا ہے اس کا ایک اور جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دار الامتحان بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے اس دنیا کو جنت نہیں بنایا ہے، یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، اس کے اندر تمھاری آزمائشیں ہو رہی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی ہے، جھوٹے حاکم اس بات سے ڈرا کرتے ہیں کہ اُس کے دشمن نہ پیدا ہو جائیں، لیکن اس حاکمِ مطلق کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے، وہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ تمام کی تمام دنیا اس کا انکار کر دے اور تمام کی تمام دنیا اس کی دشمنی کے اوپر آمادہ ہو جائے تو بھی اس کی جلالت اس کی عظمت کے اندر اس کی حکومت کے اندر فرق نہیں آئے گا تو اس بات کی پرواہ کرنا کہ اس دنیا کے اندر اللہ کے دشمن کیوں ہیں اور اس بات کی پرواہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو کیوں بنایا، یہ ان حاکموں کو ڈر ہوا کرتے ہیں اس قسم کے کہ جن کی حکومت جانے والی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کو اس بات کا ڈر نہیں۔ اسے اللہ تعالیٰ کا تو کمال یہ ہے کہ اس نے انسان کو ایک ناچیز قطرے سے پیدا کیا ہے، ایک حقیر قطرے سے پیدا کیا ہے اور پھر انسان کو اتنی آزادی دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عدو مبین بن جائے، کھلا ہوا دشمن بن جائے، یہ اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، یہ اس کی شانِ بے نیازی ہے۔ تو عزیزانِ گرامی! آپ نے دیکھا کہ یہ آیت یزید نے اس وقت دہرائی اور پھر اس نے یہ بات کہی کہ انھوں نے قطع رحمی کی تھی، قطع رحمی کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا، اب آخری نکتہ کے طور پر میں یہ عرض کروں کہ مصیبتیں طرح طرح کی ہوا کرتی ہیں، ایک مصیبت تو وہ ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جو تمھارے اوپر مصیبت آئی تو وہ تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ بہت ساری باتوں کو معاف کر دیا کرتا ہے تو یہ مصیبت جو ہے تو یہ عذاب ہے، یہ وہ مصیبت ہے کہ جس سے کسی جگہ مفر نہیں اور یہ مصیبت جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے طور پر آتی ہے وہ اس طرح آتی ہے کہ جس کے اندر نیک آدمی بھی پکڑے جاتے ہیں جس کے اندر تمام کا تمام معاشرہ پکڑا جاتا ہے اور ایک مصیبت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتائی کہ اور زمین کے اوپر جو کچھ بھی مصیبت آتی ہے اور تمھارے اوپر جو کچھ بھی مصیبت آتی ہے تو اس کو نازل کرنے سے پہلے لوحِ محفوظ کے اندر وہ موجود ہے اور یہ اس لئے تاکہ جو چیز تم سے لے لی جائے اس پر مایوس نہ ہو اور جو چیز

تمھیں دی جائے اس کے اوپر تم فخر اور تکبر نہ کرو اور اللہ تعالیٰ فخر کرنے والوں کو، اترانے والوں کو پسند نہیں کیا کرتا۔ تو دوسری مصیبت جو ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک اللہ کا بندہ اپنا کام کئے چلا جاتا ہے، اپنے فرض کی ادائیگی کئے چلا جاتا ہے اور جو کچھ بھی اس کے راستے میں آیا اور جو کچھ بھی اس کے اوپر مصیبتیں پہنچیں وہ یہ بات سمجھ کے کہ اللہ تعالیٰ ہی دینے والا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی لینے والا ہے، وہ اپنے فرض کی ادئیگی سے غافل نہیں ہوتا، وہ اپنے راستے کے اوپر برابر اسی طرح سے چلا جاتا ہے ایک مصیبت جو ہے تو وہ اس نوعیت کی ہوتی ہے، اور پھر خاص الخاص بندوں کی جو مصیبت ہے تو وہ ہے کہ جس کے اندر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آزمائش کے طور پر آتی ہے اور پھر تمھیں خوف سے، بھوک سے، نقصِ جان سے آزمائیں گے، نقصِ مال سے، نقصِ ثمرات سے، ان تمام چیزوں سے ہم آزمائیں گے اور وہ لوگ کہ جو صبر کرنے والے ہیں، ان تمام کے تمام امتحانوں میں ان کا عزم اور ان کا استقلال اور ان کا صبر اور زیادہ بڑھتا ہے، اور وہ یہ بات کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ پھر فرماتا ہے، ان لوگوں کے اوپر صلوٰت ہے اور ان لوگوں کے اوپر رحمت ہے، اور یہی وہ لوگ ہیں کہ جو صحیح ہدایت یافتہ ہیں یہ مصیبتیں گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بہانہ ہیں، یہ ان کے مرتبے کو بلند کرنے کا بہانہ ہیں۔ عزیزانِ گرامی! ایک مصیبت جو ہے تو وہ گناہگاروں کے اوپر ہوتی ہے، عذاب کے طور پر، اور ایک مصیبت اس کے خاطی بندوں کے اوپر ہوتی ہے تاکہ وہ اس سے سبق لیں اور اس سے ہدایت حاصل کریں اور ایک مصیبت وہ ہوتی ہے کہ جو امتحان کے طور پر آتی ہے اور جو خاص الخاص لوگوں کا رتبہ ہوتا ہے۔ یزید ان تمام کی تمام مصیبتوں کو کنفیوز CONFUSE کر کے ان کو آپس میں گڈمڈ کر کے اور اس مصیبت کو کہ جو اللہ تعالیٰ نے امتحان کے طور پر نازل کی اور جو اس کی ایک مشیت کو پورا کرنے والی مصیبت تھی تو اس کو معاذ اللہ وہ مصیبت سمجھتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ عذاب کے طور پر نازل کرتا ہے۔

عزیزانِ گرامی! یہ چند نکات تھے کہ جن کو میں آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا

اب آخر میں آپ یہ بات دیکھ لیں کہ جنابِ زینبؑ اسی دربارِ یزید کے اندر کھڑی ہوئی ہیں، یزید کی نظر اس آنی وفانی لمحے کے اوپر ہے اس اقتدار کے اوپر ہے کہ جس کو کوئی بقا نہیں ہے۔ جنابِ زینبؑ کے سامنے تمام کی تمام انسانیت کی تاریخ ہے اور اللہ تعالیٰ کا یومِ دین ہے، انصاف کا دن ہے، اور آپ فرماتی ہیں اس یقین کو دیکھو ایک لمحے کے لئے اس حالت کو دیکھیں کہ جس حالت میں جنابِ زینبؑ ہیں اور اس یقین کو دیکھیں کہ جس پر جنابِ زینبؑ فرماتی ہیں کہ اور اے یزید تو ہمارے ذکر کو مٹا نہیں سکتا، ہمارے ذکر کو محو نہیں کر سکتا تو ہماری وحی کو ختم نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ کے کلمۃ الحق اترا ہے جو کلام اترا ہے اس کو تو مٹا نہیں سکتا، تو ہماری مدت تک نہیں پہنچ سکتا ہے اور تو اپنے دامن سے اس عیب کو نہیں دھو سکتا، اور اے یزید تیری رائے سست ہے یہ رائے کیا ہے، یہ تدبیر کہ کسی نہ کسی طرح سے اگر حسینؑ کو قتل کر دیا جائے تو میرا تخت مضبوط ہو جائے گا، اگر اس حق کے داعی کی جان لے لی جائے تو حق ختم ہو جائے گا تو تجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ سست تدبیر ہے، یہ رائے سست ہے اس لئے کہ جب حق کے داعی کے اوپر ظلم کئے جاتے ہیں اور اسے شہید کیا جاتا ہے تو حق اور زیادہ بڑھتا ہے تو یہ تیری رائے سست ہے، یہ تیری عمر کے دن کوتاہ ہیں تو تو آگاہ ہو جا اور اس دن کے لئے تیار ہو جاؤ کہ جس دن کہا جائے گا کہ الا لعنۃ اللہِ علی الظالمین تمام ظالموں کے اوپر لعنت ہو، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد فرمائی اور فرمایا میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے ہمارے اوّل کا سعادت پر خاتمہ کیا اور ہمارے آخر کا شہادت کے اوپر خاتمہ کیا میں اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں اس بات کی کہ وہ اللہ انکے مرتبوں کے اندر بلندی دے گا۔ اور برکت دے گا۔

عزیزو! اس یقین کو دیکھو، اس یقین کو دیکھو کہ جنابِ سیّد سجادؑ دمشق کی مسجد کے اندر موجود ہیں اور مسجد کے اندر جنابِ سیدِ سجادؑ فرماتے ہیں کہ اور اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں بلائے حسن میں مبتلا کیا اور یہ کہ یہ بلائے حسن ایسے ویسے آدمیوں کے لئے نہیں آتی ہے یہ آدمیوں کو دیکھ کے آتی ہے کہ کون آدمی اس ابتلاء کے قابل ہوتا ہے۔ اور پھر آپ فرماتے

ہیں، اس بلائے حسن میں کیوں مبتلا کیا؟ اس بلائے حسن میں ہمیں یوں مبتلا کیا کہ ہمارے ہاتھ میں علم ہے، ہمارے ہاتھ میں جھنڈا ہے، ہمارے ہاتھ میں جھنڈا ہے علم کا، ہمارے ہاتھ میں جھنڈا ہے عدل کا، ہمارے ہاتھ میں جھنڈا ہے تقویٰ کا۔ اور گمراہی اور ہلاکت اس کے نشان دوسروں کے پاس ہیں اور پھر میرے مولاؑ فرماتے ہیں کہ اور ہمیں تو ان خصوصیات سے سرفراز کیا گیا ہے جو دنیا میں کسی کو نہیں دی گئی ہیں۔ ہمیں علم دیا، ہمیں شجاعت دی، ہمیں سخاوت دی، اور ایک عجیب بات فرمائی اور مومنوں کے دل میں ہمارا ایک مقام اور محبت پیدا کیا۔ اور ہمیں وہ دیا جو کبھی کسی کو نہیں دیا تھا۔ تنزیلِ قرآن ہمارے اندر ہوئی، نزولِ ملائکہ ہمارے گھر کے اندر ہوا یرزق من یشاء بغیر حساب جب اللہ تعالیٰ دینے کے اوپر آتا ہے تو بے حساب دیتا ہے، اے میرے ساتھیو! تم اپنے قلب وجان سے شہادت دو کہ یہ سچے کلمات جو امامؑ کے دہنِ مبارک سے نکلے ہیں، اس کے ایک ایک لفظ کی اور اس کے مفہوم کی ہم اپنے قلب وجان، دل وجان سے شہادت دیتے ہیں کہ بے شک امامؑ کی زبان کے اوپر اللہ تعالیٰ اپنے کلمات جاری کر رہا تھا، اور ایک بات بس آخر میں یہ کہتا ہوں کہ اے یزید اب تو تاریخ کا فیصلہ ہمارے سامنے آچکا ہے، اس وقت جو بات تو کہہ رہا تھا وہ ایک لمحے کی بات تھی، اب تو تاریخ کا فیصلہ بالکل سامنے آچکا ہے، اب تو ملک اور عزت کا مقابلہ ہو چکا، اب جو آیت تو اس وقت دہرا رہا تھا ہمیں اسی منبر کے اوپر بیٹھ کر دہراتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ ملک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممّن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشا بیدک الخیر انّک علیٰ کُلِّ شیءٍ قدیر ہ

چوتھی مجلس

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ٥

تمام حمد سزاوار ہے اس کے لئے جس کو آنکھیں ظاہر نظا ہر نہیں دیکھ سکتیں، لیکن روح ایمان کی طہارت اس کا ادراک کر سکتی ہے جس کو کوئی حجاب نہیں چھپا سکتا۔ سوائے انسان کے قلب کی غفلت کے حجاب کے، جس کے متعلق قلب بیدار کی شہادت یہ ہے کہ اگر تمام حجابات میرے سامنے سے اٹھا دیئے جائیں تو بھی علیؑ کے ایمان میں ذرہ برابر فرق نہ ہو گا۔ حمد ہے اس کے لئے جس کی حمد ہو سکتی ہے لیکن تعریف نہیں کی جا سکتی ہے جس کے متعلق اس عبد نے جو اپنے معبود سے سب سے زیادہ نزدیک مقام پر فائز تھا کہ اسکے اور اس کے معبود کے درمیان سوائے عبدیت کے اور کوئی فرق نہ تھا، اس بات کا اعتراف فرمایا کہ یا اللہ ہم تجھے پہچان نہیں سکے جیسا پہچاننے کا حق ہے تو وہ اللہ کہ جس کو سوائے انسانی فطرت کی غفلت کے حجاب کے اور کوئی نہیں چھپا سکتا اور وہ اللہ کہ جس کی اس طرح معرفت نہیں ہو سکتی کہ جو حق ہے معرفت کا ہم اس کی حمد کرتے ہیں، وہی اول ہے وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے، ارشاد فرمایا جناب امیر المومنینؑ نے کہ میں نے کبھی کسی شئے کو نہیں دیکھا لیکن میں نے اللہ کو دیکھا اس کے اول اس کے آخر اسکے ساتھ (معہٗ) اور اس کے اندر (فیہ) یہ اس کائنات کا اور زندگی کا اللہ کے نور سے مشاہدہ ہے اور میں درود بھیجتا ہوں محمد مصطفیٰؐ پر کہ انھوں نے انسانی قلوب کو زندہ کیا اور انسانی قلوب کو آنکھیں بخشیں اور جس وقت کہ انسانی قلوب کو زندہ کیا ہر طرف اللہ کی آیات اور نشانیاں نظر آنے لگیں، چاروں طرف دیکھا تو اور اپنے اندر دیکھا تو ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی آیات نظر آنے لگیں۔ دن میں سے رات کا نکلنا اور رات سے دن کا نکلنا، یہ اللہ تعالیٰ کی نشانی بن گیا، کشتیوں کا دریا کے اوپر چلنا یہ اللہ تعالیٰ کی نشانی بن گئی اور پانی کا برسنا کہ جس سے مردہ زمین میں جان آجائے

یہ اللہ تعالیٰ کی نشانی بن گئی، اپنے اس وجود کو دیکھا کہ ہم کچھ نہیں تھے اور کچھ بن گئے، یہ اللہ تعالیٰ کی نشانی بن گئی۔

اس نے بشر کو مٹی سے پیدا کیا، پھر بشر کو دنیا کے اندر پھیلایا یہ آپس میں مودت آپس میں ایک دوسرے کی طرف کشش یہ اللہ تعالیٰ کی نشانی ہوگئی یہ دنیا کے اندر طرح طرح کے رنگ رکھنے والے اور یہ طرح طرح کی زبانیں بولنے والے آدمی یہ فرق آپس میں الوان کا اور زبان کا یہ اللہ تعالیٰ کی نشانی بن گیا اور پھر جس وقت کہ قلب بیدار و بینا سے دیکھا وہ قلب کہ جس کو محمد مصطفےٰؐ کی تعلیم نے بیدار کیا تھا اور جسے اس تعلیم نے دیکھنا سکھایا تو معلوم ہوا کہ آپس میں دو گروہ جو باہم متصادم ہوں وہ بھی اللہ کی نشانی ہے اور اس گردشِ ایام میں اس قوموں کے عروج و زوال میں اس بات کے اندر کہ آج ایک قوم سرفراز ہے، کچھ وقت کے بعد جس وقت کہ اس کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو محض تاریخ کے اندر اس کا افسانہ رہ جاتا ہے اس قوم کا نام و نشان نہیں رہتا تو اس گردشِ ایام کے اندر اس قوموں کے عروج و زوال کے اندر اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں صبر کرنے والوں کے لئے شکر کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی بڑی آیات ہیں گویا وہ تمام چیزیں کہ معلوم و محسوس ہیں جو ہمارے سامنے کی ہیں بین یدیھم ہمارے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں ہیں جن کو تم قابلِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے ان کے اندر اللہ تعالیٰ آیات اور اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

تو وہ قلب اور وہ آنکھیں جس نے ہمیں بخشی ہیں اس پر صلوٰت اور ہمارا سلام ہو ائمۂ ہدیٰ پر جو اس گردشِ زمانہ میں اور وقت کے سیلاب میں خود حق کا نشان بن کر حق پر قائم رہے اور تمام دنیا کو صبر و استقلال کے ساتھ حق کے اوپر جمع رہنے کی تلقین کرتے رہے وتواصو بالحقِ وتواصو بالصبر وہ محکم جبل یعنی پہاڑ کہ جن کے دامن کے اندر سینکڑوں طوفان کھیلتے رہے لیکن ان کی بلندی کو کوئی طوفان چھو نہیں سکا، وہ منارۂ نور کہ وقت کے تھپیڑے ان کی بنیادوں کو ہلا نہیں سکے اور چاروں طرف گھری ہوئی ظلمتیں جن کے نور کو مدھم نہیں

کر سکیں، ہماری خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس بات کی توفیق دے کہ اپنی روح کی ظلمتوں میں اور وقت کے طوفانوں میں اسی نور سے ہم ہدایت حاصل کریں اس لئے کہ اس نور کے علاوہ باقی سب اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

عزیزانِ گرامی! کلامِ پاک اللہ تعالیٰ کی رحیمیت اور رحمانیت کا ثبوت ہمارے پاس موجود ہے، اس کتاب کے اندر دیکھیں تو یہ بات کہی گئی ہے کہ دنیا کے تمام خشک و تر اس میں ہیں، لیکن اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں کہ کچھ بیّن مضامین ہیں جن کو اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ کلامِ پاک کے اندر ایک حصہ ایمان و عقیدے سے متعلق ہے، ایک حصہ احکام سے متعلق ہے، ایک حصہ تذکیر بالآءِ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد دلا گیا ہے، ایک حصہ موت و قیامت کو ذکر کر کے تذکیر کی گئی ہے، نصیحت کی گئی ہے اور ایک حصہ ہے اس کا تذکیر بایام اللہ یعنی جو تاریخ کے اندر تبدیلیاں ہوئی ہیں، جو قوموں کے اندر عروج و زوال ہوئے ہیں، جو ایک گروہ دوسرے گروہ کو دفع کرتا ہے کہ اور پھر اس کی جگہ متمکن ہوتا ہے تو ان کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے نصیحت کی ہے تو گویا مختصر یہ صورت ہے۔

اور پھر بڑے احتیاط کے ساتھ کلامِ پاک کے متعلق یہ بات عرض کرتا ہوں کہ کلامِ پاک کی کیفیت یہ ہے کہ اس کا قاری اپنے علم اور اپنے ظرف اور اپنے تقویٰ کے مطابق ہی اس کے معنی سمجھ سکتا ہے، اس کتاب کی بابت یہ بات کہی گئی کہ یہ کتاب ہدایت کرنے والی بھی ہے۔ اور یہ کتاب گمراہ بھی کر دیتی ہے گویا جو تقویٰ کے ساتھ ہدایت کی طلب کے ساتھ، ہدایت کی جستجو کے ساتھ اس کتاب کو کھولتا ہے اور جو سچے ہادی ہیں ان سے اس کا سبق لیتا ہے، ان کی یہ کتاب ہدایت کرتی ہے اور جو اپنے گمان کو اپنے ذہن کو اپنے خیال کو اس میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے جو اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے یہ بات کہنی ہے تو کچھ نہ کچھ اس کی تائید قرآن شریف کے اندر مل جائے اور کسی نہ کسی طرح سے اس آیت کے معنی ایسے ہو جائیں کہ میں اس سے تائید حاصل کر سکوں اپنی بات کی یا کچھ اس قسم کے معنی میں کر سکوں کہ جس سے لوگوں کی طبیعت خوش ہو جائے انھیں یہ بات گمراہ کرنے والی ہے۔

اور بیشک نہ اس سے زیادہ ہدایت کرنے والی کتاب ہے نہ اس سے زیادہ گمراہ کرنے والی کوئی کتاب ہے جبھی تو کہا تھا کہ اس کتاب کے اندر ہدایت ان لوگوں کے لئے ہے جو تقویٰ والے ہیں اور تقویٰ کے بڑے منازل ہیں تقویٰ کہتے ہیں نقصان سے بچ کر بری باتوں سے بچ کے سیدھی راہ پر چلنے کی کوشش کو تقویٰ کی بلند ترین منزل پر وہ ہیں کہ جو صراطِ مستقیم پر چلنے والے ہیں جنھوں نے اس صراط کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے لیکن جہاں اس بات کی طلب اور جستجو اور خواہش ہے کہ کسی طرح سے برائیوں سے اور کانٹوں سے اپنے دامن کو بچائیں اور سیدھا راستہ ہمیں مل جائے تو یہ بھی تقویٰ کی پہلی منزل ہے اس لئے کہ جب تک دل میں جستجو نہیں ہوتی جب تک دل میں طلب نہیں ہوتی تو اس وقت تک راستہ نہیں ملا کرتا۔

ہم اپنی بساط کے مطابق کلامِ پاک کو سمجھنے اور اس کے مضامین میں غور و فکر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اس کے مضامین کو دیکھا جائے تو اس میں ایمان و عقائد کا ذکر ہے، پھر اس کے بعد احکام کا ذکر ہے پھر تذکیر با لآءِ اللہ ہے پھر اس کے اندر تذکیر موت و قیامت کے ذریعے سے ہے پھر تذکیر با یام اللہ ہے، اب ایمان و عقائد کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں یہ ہے کہ ایمان لاؤ غیب کے اوپر اور ایمان لاؤ پیغمبروں کے اوپر اور ایمان لاؤ ان چیزوں کے اوپر جو تم سے پہلے پیغمبروں کے اوپر گذر چکی ہیں اور ان چیزوں پر ایمان لاؤ کہ جو محمدؐ مصطفےٰ کے اوپر اتری ہیں اللہ کی کتابوں کے اوپر ایمان اور مختصراً میں آپ سے عرض کر دوں کہ پہلی پہلی بات جو ہے تو وہ یہ ہے کہ اللہ کے اوپر اور روزِ قیامت کے اوپر ایمان لاؤ یعنی اس بات پر ایمان لاؤ کہ تم اپنے افعال و اعمال کے متعلق جواب دہ ہو اللہ کے سامنے اور اللہ تعالیٰ رب الناس ہے ملک الناس ہے الٰہ الناس ہے، اس بات کے اوپر ایمان لاؤ تو یہ گویا دینِ قیّم ہے اس وقت میں دین کی مختلف روایتوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، وہ دین حضرت ابراہیمؑ لے کے آئے ہوں یا حضرتِ موسیٰؑ لے کے آئے ہوں یا حضرتِ عیسیٰؑ لے کے آئے ہوں جو صحفِ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے اندر ہے تو بہرحال یہ دین کی اساس ہے۔ یہی دینِ قیّم ہے جس کے متعلق یہ بات کہی گئی کہ جو لوگ اللہ کے اوپر ایمان لائے اور جو روزِ قیامت کے اوپر ایمان لائے تو ان کے عمل

رائیگاں نہیں جائیں گے، ان کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا اور خاص طور کے اوپر توضیح بھی کر دی گئی کہ وہ خواہ عیسائی ہوں یہودی ہوں، صابی ہوں کوئی ہوں تو گویا اگر اللہ اور قیامت پر یقین ہے تو پھر انسان اپنے عمل کا بدلہ پائے گا۔ لیکن اگر اس کے علاوہ عمل کا کوئی اور موجب یا محرک ہے اگر کسی کے عمل کا موجب یہ ہوتا ہے کہ آدمی شہرت حاصل کرے تو اس کا عمل خالصاً للہ نہیں ہوتا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے اوپر یہ حق بھی نہیں کہ اس کی جزا دے یا اس کا بدلہ دے۔

اب صورت یہ ہوئی کہ دین کی جو بنیادی قدر ہے وہ ہے عقیدۂ توحید اور عقیدۂ قیامت یعنی ایک اللہ کے اندر ایمان لانا اور روز قیامت کے اندر ایمان لانا اس لئے کہ روزِ قیامت کے اندر ایمان لانے کے یہ معنی ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو ذمہ دار اور مسئول سمجھتا ہے روزِ قیامت کے اندر اس کا ایمان نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں سمجھتا وہ یہ نہیں سمجھتا کہ کوئی سوال اس سے کرے گا اور اس کو جواب دینا پڑے گا، اس کے بعد عزیزانِ گرامی جس وقت کہ آپ نبوت پر ایمان لے آئے اور یہ مان لیا کہ محمد مصطفیٰؐ آخری نبی ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کو ہدایت اور پیام بھیجنا تھا تو وہ ان کے ذریعہ سے بھیج گیا اور ان ہی کے ہاتھ پر دین کا اکمال ہو گیا، انھیں کے ہاتھ پر نعمتوں کا اتمام ہوا، ان ہی کے ہاتھ کے اوپر دین کی وہ صورت ہو گئی کہ جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا تو پھر دائرۂ اسلام کے اندر داخل ہو گئے، پھر آپ مسلمان بن گئے، اس لئے کہ رسولؐ امت کی تاسیس کرنے والا ہوتا ہے، آپ نے اپنے مؤسس کو مان لیا، یہ مان لیا کہ ملت کی بنیاد رکھنے والا رسولؐ ہے تو اس کے بعد آپ دائرۂ اسلام کے اندر داخل ہو گئے، آپ کے لئے سلامتی ہے، ایک ایمان تو یہ ہے، گویا ایمان اللہ کے اوپر، ایمان آخرت کے اوپر اور ایمان نبوت کے اوپر اور اس جگہ آپ ملت کے اندر داخل ہو گئے، سلامتی کے اندر داخل ہو گئے اب اگر آپ نے یہ بھی سمجھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کا اور اس دنیا کا کیا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کا اور بندوں کا کیا تعلق ہے اور آپ نے یہ مانا کہ اللہ تعالیٰ مالک یوم الدین بھی ہے اللہ تعالیٰ عادل بھی ہے تو اب آپ بہت ساری گمراہیوں سے بچ گئے۔ یعنی اب آپ اس کی رحیمی کو غلطیوں نہیں سمجھ سکتے

کہ وہ رحیم ہے اس لئے آپ کچھ ہی کیے جائیے اللہ تعالیٰ معاف کردے گا اور آپ اگر اس کی قہاری کے اوپر غور کریں تو آپ مایوس نہیں ہوں گے وہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ عدل کرنیوالا ہے، وہ رحیم ہے تو وہ قہار بھی ہے تو اس طرح آپ کو اس بات کی فہم حاصل ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے کیا تعلق ہے اور آپ کو اس بات کی بھی بصیرت حاصل ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا اس دنیا کے ساتھ کسی قسم کا رشتہ ہے اور اگر آپ نے نبوت کے بعد امامت کو بھی مان لیا تو پھر آپ یہ سمجھ گئے کہ بیشک نبوت تو محمد مصطفیٰؐ پر ختم ہو گئی لیکن اللہ کی ہدایت کا جو سلسلہ ہے تو وہ جاری ہے اور وہ قیامت تک جاری رہے گا تو اس کے بعد آپ کو صحیح ہدایت مل گئی، عدل اور امامت کو اگر آپ نے مان لیا تو آپ ہدایت کے صحیح راستے کے اوپر آئے اگر آپ نے ان دو باتوں کو نہیں مانا تو آپ نے اپنے آپ کو اس سعادت سے محروم رکھا بہر حال اگر وہ پہلی تین باتیں آپ نے مان لیں تو آپ ملتِ اسلام کے اندر داخل ہو گئے۔

تو آپ نے دیکھا کہ کلامِ پاک کا ایک حصّہ ایمان اور عقیدوں کے متعلق ہے یعنی اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہ ماننا، اس کو وحدہٗ لاشریک سمجھنا اور اسی کو مالک یوم الدین سمجھنا اور اس کے بھیجے ہوئے ہادیوں پر ایمان لانا۔ اب ظاہر ہے کہ جس وقت آپ رسولؐ کو مانتے ہیں اور امامؑ کو مانتے ہیں تو وہ بیچ کی کڑی یعنی ملائکہ کو مانیں گے جس وقت کہ اللہ تعالیٰ کو آپ مانتے ہیں کہ وہ منتظم ہے، وہ حکم دینے والا ہے تو ظاہر ہے ملائکہ کو آپ مانیں گے تو یہ تمام کی تمام باتیں جو ہیں تو وہ تفصیلات میں آجاتی ہیں، بہر حال ایمان کے جو اصول ہیں تو وہ بنیادی اصول توحید کا اور قیامت کا پھر اس کے بعد مسلمان بنانے والی بات وہ نبوت کا اصول ہے اس کے ساتھ اور ہدایت کرنے والے اور ایمان کو اور مستحکم کرنے والے اصول تو وہ عدل اور امامت ہوئے یہ ایمان کے اصول ہوئے، پھر ایک حصّہ اس کتاب کا احکام سے متعلق ہے، اس حصّہ میں آپ کے نفس کا خیال رکھا گیا ہے، آپ کی اس دنیاوی زندگی کا اور آپ کی فطرت کا خیال رکھا گیا ہے اور اس کے اوپر آپ کو احکام دیئے گئے ہیں اور معاشرے کا خیال رکھا گیا ہے، اور ایک بات میں آپ سے کہہ دوں جس پر ہم خاص طور سے زور دینا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ آپ کے گھروں کا خیال رکھا گیا ہے گویا زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جسے

نظر انداز کیا گیا ہو، دشمنوں سے کیسا تعلق ہونا چاہیئے، دوستوں سے کیسا تعلق ہونا چاہیئے اس لئے کہ اگر تمھارے دشمن تمھیں نقصان پہنچاتے ہیں تو دوستوں کی محبت بھی نقصان پہنچا سکتی ہے، یہ بھی بتایا گیا ہے کہ محبت کے کیا حدود ہوتے ہیں، محبت کے کیا تقاضے ہوتے ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ ان تمام محبتوں کو اللہ نے اپنی محبت کے نیچے رکھا ہے۔ غرض زندگی کے جتنے شعبے ہوسکتے ہیں اور جتنے فرائض ہوسکتے ہیں وہ تمام کے تمام فرائض آپ کو ان احکام کے ذریعے سے بتا دیئے گئے کہ یہ بات تم کرو اور یہ نہ کرو۔

ایک حصہ کلام پاک کا وہ ہے کہ جس میں کہ اللہ کی نعمتیں تمھیں بتائی گئی ہیں، وہ نعمتیں کہ جن کو تم جانتے تھے لیکن جن کی طرف سے تمھاری آنکھیں بند تھیں، انکی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اپنے معاد کے اندر فکر کرنا تو بعد کی بات ہے کبھی اپنے مبدا کے اندر غور نہیں کیا کہ تم کچھ نہیں تھے اور کچھ ہو گئے تو ان تمام باتوں کا عام نعمتیں ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے ذریعے سے تذکیر کی گئی موت و قیامت کے ذریعے سے تذکیر کی گئی، موت کے ذریعے تو یہ کہ اس دنیا کے اندر زیادہ ملوث نہیں ہونا ہے، اس لئے کہ بالآخر اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہے اور یہی ایک وہ حقیقت ہے کہ جس سے زیادہ کوئی عام حقیقت نہیں ہے اور یہی وہ حقیقت ہے کہ جس سے آدمی غافل رہنے کی کوشش کرتا ہے، کلام پاک کے اندر یہ بات بتائی گئی کہ دیکھو ایک حقیقت سے آنکھیں بند کر لینے سے وہ حقیقت ختم نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ اس حقیقت کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو اور قبول کرو کہ یہ حقیقت ہے اور اس کو اگر تم مانو گے تو زندگی کی معنویت اور زندگی کا مقصد بھی تمھاری سمجھ میں آجائے گا اور یہ بات بتائی گئی کہ دیکھو جزا اور سزا کا دن جو ہے تو وہ مقرر ہے تو اس طور کے اوپر ہماری نصیحت کی گئی ہے اور ایک نصیحت جو ہمیں کی گئی تو وہ یہ ہے کہ دیکھو جب اپنے پہلے والوں کو دیکھو ان قوموں کو اگر دیکھو کس عروج پر تھیں کیا کیا نعمتیں اللہ تعالیٰ نے دی تھیں اور اب تم دیکھو کہ کیا کیفیت ان کی ہے، اکثر تم ان کی بستیوں کو دیکھو گے کہ وہ اجاڑ پڑی ہیں، کنویں ان کے اندھے ہو چکے ہیں، چھتیں جو ہیں تو ان کی گری ہوئی ہیں ان تمام چیزوں کو دیکھو غور کرو اور ان سے عبرت حاصل کرو یہ گویا

تذکیر بایام اللہ ہے۔ تو یہ مختلف حصے کلامِ پاک میں ہیں، اب ضمناً میں آپ سے ایک بات عرض کرتا ہوں، عزیزو قرآن جو ہے تو وہ محض احکام کا نام نہیں ہے محض فقہ کا نام نہیں ہے تو محض فقہ کو رائج کرنے کے بعد اگر تم یہ سمجھو کہ تم اسلام کو لے آئے ہو تو اس بات سے بہت زیادہ غلط فہمیاں ہوتی ہیں، اس لئے کہ جیسا میں نے آپ سے عرض کیا قرآن کے تو بہت سارے مضامین ہیں ان میں سے ایک حصّہ احکام کا ہے باقی تذکیر کا ہے، ایمان کا ہے، عقیدے کا ہے اور پھر یہ احکام جو ہیں، عقیدے جو ہیں تو یہ بھی اسی کا ایک حصّہ ہیں اس لئے کہ حقیقت حقیقت واحدہ ہے اس سے کسی چیز کو علیٰحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے تو وہ احکام جو ہیں تو اسی (CANTEXT) سیاق وسباق کے اندر آگئے اور اسلام تو اسلام کا جہاں تک تعلق ہے تو عزیزانِ گرامی محض قرآن بھی اسلام نہیں بلکہ قرآن اور حاملِ قرآن دونوں مل کر اسلام بنا کرتے ہیں اور حاملِ قرآن کو تم اس طرح سے ملاؤ کہ تم یہ سمجھو کہ یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے، یہ وحدت قرآن اور حاملِ قرآن کی، وہ مقام اسلام کا ہے چہ جائیکہ تم قرآن شریف کے ایک حصہ کو احکام پر عمل کرنے کے حصے کو لے کر تم یہ سمجھو کہ تم اسلام لے آئے ہو اسلام پھیلا رہے ہو تو یہ ایک غلط فہمی تھی جس کی طرف میں نے ضمناً اشارہ کیا بلکہ جب یہ بات آہی گئی ہے تو میں ایک بات، آپ سے عرض کروں اور وہ یہ ہے کہ یہودیوں سے ایک جگہ کلامِ پاک کے اندر اللہ تعالیٰ خطاب کر کے کہتا ہے کہ یہ تم عجیب لوگ ہو کہ کچھ حصے کو اس کے مانتے ہو اور کچھ حصے کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیتے ہو، اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر دین محض احکام کی بات ہوتی تو اگر کسی نے دس احکام میں سے، چار پانچ احکام مان لئے تو اس حد تک اچھی بات کی۔ لیکن تعجب کی بات اس لئے ہے کہ اگر دین کا کچھ حصّہ پیچھے پھینک دیا گیا تو وہ حصّہ بھی جسے لوگ پکڑے ہوئے ہیں بے جان بن جائے گا۔ ایک زندہ اور کُل حقیقت کی یہی شان ہوتی ہے۔

عزیزانِ گرامی! کل کی گفتگو میں میں نے تذکیر بایام اللہ کے متعلق کچھ باتیں عرض کی تھیں، آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ جس وقت حکومت آتی ہے تو لوگ مذہب کی قدروں کو بدل

دیتے ہیں۔ اب میں ایک بات آپ سے عرض کروں اور وہ یہ ہے کہ یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے کہ جس وقت کسی نئی قوم کے اندر زندگی آتی ہے تو وہ قوم پھیلتی ہے بڑھتی ہے بلکہ وہ قوم وارث بن جاتی ہے ان قوموں کی کہ جن کی زندگی ختم ہو چکی ہے جس طریقے سے کہ مسلمان وارث بن گئے روما کی تہذیب کے اور ایران کی تہذیب کے، یہ ایک فطری تاریخی عمل ہے مگر جو اسلام کی خصوصیت ہے تو وہ یہ کہ اسلامی فتوحات کے بعد لوگ جوق در جوق مسلمان ہو گئے اس لئے کہ وہ یہ بات دیکھتے ہیں کہ اس معاشرے میں عدل کا معیار، انصاف کا معیار بہتر ہے اور انسان کی بہ حیثیت انسان قدر زیادہ ہے بہ نسبت اس معاشرے کے جس میں وہ افراد تھے اور دوسری بات یہ ہوئی کہ فتح کے بعد ایک طرف مفتوح ملک میں معاشرے نے اسلام کو قبول کر کے ایک نئی زندگی حاصل کر لی اور دوسری طرف خود اسلام نے ایک نئے

ثقافتی ماحول میں پھیل کر کچھ نئی جہتیں اور وسعتیں نمایاں کیں۔ مثال کے طور پر جب عجم فتح ہوا تو ایک طرف عجمیوں کے اسلام میں داخل ہونے سے علوم اسلامی نے ترقی کی نئی نئی راہیں نکالیں اور دوسری طرف یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ معاشرے میں اتنی جان آ گئی کہ جب بنو امیہ نے اسلام کے نام پر عرب سامراج کی بنیادیں مستحکم کر لیں تو اس کے مقابلہ میں ردِ عمل کے طور پر عباسی انقلاب بہت حد تک ان ہی عجمی اسلامی اثرات کا مرہونِ منت ہے۔

اس طرح ملکوں کا فتح ہونا تو ایک تاریخی واقعہ ہے، اور عرب مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی دوسری قوموں نے بھی غیر ممالک کو فتح کیا، اسلام کے لیے یہ کوئی قابلِ فخر امتیاز نہیں ہے۔ لیکن یہ بات کہ مسلمانوں کی فتوحات سے فاتح اور مفتوح قوموں میں نفرت کی خلیج پیدا ہونے اور دوسری قوموں کی زندگی میں مضر اثرات مرتب ہونے کی بجائے مشترکہ معاشرے میں زندگی میں ایک نئی حرکت، تہذیب میں رچاؤ اور اسلامی تجربے میں نئے زاویے پیدا ہوئے، یہ بات اسلام ہی کی برکت ہے، حکومت کو اور ملک کی وسعت کو اسلام کی توسیع سمجھنا اس سے زیادہ اور کوئی غلط فہمی نہیں ہے، ہاں ان کا مقام بھی بتایا گیا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کو دفع کرتا ہے اور خود اس کی جگہ لے لیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ یہ

بتاتا ہے کہ اگر ایک گروہ دوسرے گروہ کو دفع نہ کرتا تو دنیا کے اندر فساد پیدا ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ تو عالمین کے اوپر بڑا فضل کرنے والا ہے، ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک گروہ دوسرے گروہ کو دفع نہ کرتا تو تم یہ دیکھتے کہ یہ تمام کی تمام عبادت گاہیں اور عیسائی کی ہوں یا یہودیوں کی ہوں یا مسلمانوں کی ہوں جن کے اندر اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے یہ منہدم ہو چکی ہوتیں اور اللہ تعالیٰ ان کی نصرت کرتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی نصرت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا قوی اور بڑا عزیز ہے وہ قوت والا ہے اور عزت والا ہے تو یہ کلامِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے گویا اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہے ہمارے اوپر کہ ایک گروہ ہمیشہ اقتدار پر قابض نہیں رہتا اس دنیا کے اندر اگر کوئی فرعون، فرعون ہونے کا دعویٰ بھی کرتا ہے تو پھر یا تو اللہ تعالیٰ اس دعوے کو چیلنج کرنے والا کوئی دوسرا فرعون صفت پیدا کر دیتا ہے اور آخر میں ان فرعونوں کی لڑائی شروع ہوتی ہے یا پھر موسیٰ کے ورثہ دار کو پیدا کر دیتا ہے اور اس فرعون کی حاکمیت ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی اقتدار جو ہے تو وہ قائم رہے اس لئے اگر ایک ہی اقتدار قائم رہنے والا ہوتا تو پھر اللہ کے اقتدار میں اور اس کے اقتدار میں فرق کیا ہوتا تو پھر لوگ اس کی پرستش کرتے پھر مسجدوں کی گرجاؤں کی کیا ضرورت تھی، پھر تو اسی کا آستانہ اس قابل تھا کہ جس کے اوپر سجدہ کیا جائے اس کے اوپر سر جھکایا جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی غیرت کبھی اس بات کو برداشت نہیں کرتی کہ تمام دنیا کے اوپر دائمی قبضہ رکھنے والا ایک فرعون ہو یا ایک ہی شخص اقتدار پر جا رہے وہ ایک گروہ سے دوسرے گروہ کو دفع کرتا رہتا ہے اس لئے کہ اگر وہ یہ بات نہ کرتا تو دنیا فساد سے بھر جاتی، اور فساد جیسا کہ میں اپنی ایک تقریر میں آپ کے سامنے عرض کر چکا ہوں، فساد کے معنی ہیں حد سے بڑھنا، فساد کے معنی ہیں ظلم اور فساد کا مقابلہ کیا جاتا ہے جہاد سے، ایک چیز فساد ہے ایک چیز جہاد ہے جس جگہ جہاد نہیں ہوتا (اور جہاد دونوں طرح سے جہادِ اکبر ہو یا جہادِ اصغر) تو اس جگہ فساد ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ عالمین کے اوپر بڑا فضل کرنے والا ہے اور دوسری آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے اور جو

اللہ کی نصرت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی نصرت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو قائم کیا جائے، حق کے خلاف جو حملے ہوں ان کو دفع کیا جائے، اور جس وقت تم یہ کروگے تو تم اللہ تعالیٰ کی نصرت کر رہے ہو اور جب تم اللہ کی نصرت کروگے تو اللہ تعالیٰ تمھاری نصرت کرے گا اور تمھیں معلوم ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ تمھاری نصرت کرنے کے اوپر آگیا تو اللہ تعالیٰ قوی وعزیز ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت ہی کا دوسرا نام جہاد ہے جو فساد کی ضد ہے، اس جہاد کے ذریعہ لوگوں کے ایمان کی آزمائش کی جاتی ہے، جنگِ احد میں مسلمانوں کی کچھ کمزوری کی وجہ سے عارضی شکست ہوئی پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان شکستوں کو درگذر فرمایا اور بات جو تھی وہ بن گئی لیکن بعض لوگوں کے دلوں میں ایمان کی کمزوری کی وجہ سے باطل کی ہیبت بیٹھ گئی، اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے ذریعے سے اس ہیبت کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ بات بتائی جاتی ہے کہ اگر مسلمان زخمی ہوئے تو ان کے مقابل کو بھی نقصان پہنچا ہے وہ بھی تو زخمی ہوئے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ایام کو لوگوں کے درمیان پھراتے ہیں تلک الایام نداولہا بین الناس آج اس کا دن ہے تو کل اس کا دن ہے آج یہ ذرا زیر ہوگیا تو کل وہ زبر ہوگیا تو یہ تو اللہ تعالیٰ ان ایام کو لوگوں کے درمیان گردش کرتا ہے مقصد یہ ہے کہ معلوم ہوجائے کہ حق کی مدد کرنے والا کون ہے ایمان والا کون ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس آزمائش میں جو پورا اترتا ہے اس کو ہم حق کے اوپر گواہ بنا لیتے ہیں اس کو ہم شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور نہ ظلم کو پسند کرتا ہے، اور یہ تمام باتیں اس لئے ہیں کہ ایمان جو ہے تو وہ خالص ہوجائے اور باطل مٹ جائے تو اللہ تعالیٰ نے جنگِ احد کے موقع پر یہ آیتیں نازل فرمائیں گویا پہلی آیت کے اندر ہمیں یہ بتایا گیا کہ دیکھو عُسر یُسر کی تمام باتیں تو ہوتی رہتی ہیں، یہ حادثاتِ زمانہ ہوتے رہتے ہیں یہ جنگیں اور یہ تصادم جو ہیں تو یہ تو ہوتے رہتے ہیں دیکھنے کی بات کیا ہے؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تم اللہ کی نصرت کر رہے ہو یا تم اللہ کی مخالفت کر رہے ہو دیکھنے کی بات کیا ہے؛ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تم ظلم

تو نہیں کر رہے ہو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی نصرت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نصرت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حق کو بڑھاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قول کو بڑھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد کیا کرتا ہے۔

اب ایک دوسرے موقعہ کو دیکھئے صورت جو ہے تو وہ یہ ہے کہ جزیرۃ العرب کے ایک سمت سلطنتِ روما ہے دوسری طرف ایران ہے، ان دونوں کی تہذیبیں کمزور ہو گئیں، یہ آپس میں لڑتی ہیں، وہی صورت ہے اللہ تعالیٰ ایک فرعون کو نہیں رہنے دیتا ہے بیچ میں دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں وہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ جزیرۃ العرب میں ایک قوم تربیت پا رہی ہے جو کہ وارث بننے والی ہے، ایران کی اور روما کی۔ اب اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے اندر فرماتا ہے (سورۂ روم کے اندر غلبت الروم روم مغلوب ہو گیا، گویا روم و ایران کے اندر لڑائیاں ہوئیں، مسلمان وہ تھوڑا سا روم کی طرف جھکتے ہیں اس لئے کہ وہ عیسائی ہیں اور اہلِ کتاب ہیں۔ مشرکینِ ایران کی طرف جھکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روم مغلوب ہو گیا۔ ایک نزدیک ہی ملک کے اندر لیکن کچھ برسوں کے بعد تین سے زیادہ اور دس سے کم پھر وہ غالب ہو گئے، روم والے غالب ہو گئے پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ امر تو پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں تھا اور بعد میں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے یعنی یہ تمام کا تمام تماشا جو ہو رہا ہے اس کے معنیٰ اگر تمہیں سمجھنے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت پر غور کرو اور اس حقیقت کو سمجھو کہ امر اول و آخر اسی کے اختیار میں ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اور اس دن "مومن اللہ تعالیٰ کی نصرت سے خوش ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کی نصرت کیوں ہوگی، وہ اس وجہ سے کہ مومن اللہ تعالیٰ کی نصرت کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی وعدوں سے کبھی خلاف نہیں جاتا اور وعدہ اللہ تعالیٰ کا کیا ہے، وعدہ اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ اگر تم مومن ہو تو غالب بن کے تم ہی رہو گے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس دنیا کی ظاہری حالت پر لوگوں کی نگاہ ہوتی ہے آخرت کو وہ نہیں دیکھتے، اس بات کو وہ دیکھتے ہیں کہ یہ ہارا اور وہ جیتا لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ پس پردہ جو امرِ الٰہی کام کر رہا ہے

اس کا رُخ کیا ہے وہ لوگوں کے مکر تو دیکھتے ہیں لیکن مکر اللہ کو یعنی اللہ تعالیٰ کے PLAN کو اللہ تعالیٰ کی تدبیر کو نہیں دیکھتے، جو سطحی باتیں ہیں، جو ظاہر کی باتیں ہیں ان کے اوپر ان کی نگاہ ہوتی ہے لیکن اس کے اندر جو امر الٰہی ہے اس کا جو نتیجہ ہونے والا ہے اس کو وہ نہیں دیکھتے۔ اسی بات کے اوپر اللہ تعالیٰ کہتا ہے، اللہ تعالیٰ کے جو طریقے ہوتے ہیں ان کو دیکھو، اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ جس وقت کہ قوم ان نصیحتوں کو بھلا دیتی ہے کہ جو نصیحتیں قوم کو کی گئی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ہم ایسے لوگوں کو فوراً ختم کر دیتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان پر ہم تمام چیزوں کے دروازے کھول دیتے ہیں، گویا ان کو ہر قسم کی دولت بھی مل جاتی ہے طاقت بھی مل جاتی ہے، جو بات وہ چاہتے ہیں تو وہ مل جاتی ہے اور پھر جس وقت کہ وہ بہک جاتے ہیں، وہ متکبر ہو جاتے ہیں، وہ غرور کرنے لگتے ہیں ان چیزوں کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کا انتقام ان کو پکڑ لیتا ہے گویا کیا صورت ہوئی وہ کس طریقے سے بہک جاتے ہیں، میں اس طرح سے اس کی توضیح کروں کہ جب وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہماری بقاء کا راز ہماری دولت یا ہماری طاقت ہے اور جس وقت کہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں قارون کی طرح سے جیسے قارون نے کہا تھا کہ یہ دولت تو میں نے اپنے علم سے جمع کی تھی تو اللہ کو کیا اختیار ہے کہ وہ اس میں سے حصہ بانٹے جس وقت کہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ تمام کی تمام دولت اور قدرت ہمارے علم کی وجہ سے ہے اور جس وقت کہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ علم اور قدرت تو اللہ تعالیٰ کے ذاتی اسم ہیں علیم و قدیر تو اسی کی ذات ہے۔ اور جس وقت کہ وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ قوموں کی بقاء، دولت اور طاقت میں نہیں ہے بلکہ حق اور عدل پر منحصر ہے، اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ جو ان سے کی گئی تھی تو پھر عذاب الٰہی ان پر نازل ہو جایا کرتا ہے اور پھر وہ قومیں ختم ہو جایا کرتی ہیں۔

تو عزیزانِ گرامی! اکثر قومیں، اگر تم دنیا کی تاریخ کو دیکھو تو وہ اپنی دولت اور طاقت کے اندر ختم ہوئیں وہ اس وجہ سے کہ وہ اس حرفِ جاں بخش اور اس فکرِ حیات آفریں کو بھلا چکی تھیں جس میں قوموں کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ

دولت کی ہوس اتنا ہی زیادہ اور بڑھ جاتی ہے۔ بھوک سے سیری ان کو کبھی نہیں ہوتی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بتا چکا ہے کہ خوف سے امن تک تمھیں پہنچنا ہے، بھوک سے سیری تک پہنچنا ہے تو فلیعبدوا رب ھٰذا البیت اس کا طریقہ جو ہے تو وہ عبادت ہے اس گھر کے رب کی عبادت کرو تو اس کے بعد تم بھوک سے سیری حاصل کروگے اور تمھیں خوف سے امن حاصل ہو سکے گا اور اس کے علاوہ اگر اور کوئی تدبیریں کرنی ہیں تو تم آزما لو جتنی تم سیری اور امن کی تدبیریں کروگے ہوس کی بھوک اور خوف بڑھتے جائیں گے اور بظاہر تو ایک قوم اپنے بچاؤ کے لئے کوشش کر رہی ہے اور دوسری قوم اپنے بچاؤ کے لئے کوشش کر رہی ہے کسے معلوم کہ یہی بچاؤ کی کوشش اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہونے کا ایک سبب بن جائیں، وہ مسبب الاسباب اپنا حکم صادر کرنے کے لئے اور اپنا عذاب نازل کرنے کے لیے انھیں کو اپنا سبب نہ بنائے اس لئے کہ جب میرے پاس بھی ہتھیار ہیں اور دوسری قوم کے پاس بھی ہتھیار ہیں تو ظاہر ہے کہ انھیں ہتھیاروں کے اندر آگ لگ جانا یہ تو اتفاقی حادثہ ہوگا اور اسی حادثہ سے دنیا ختم ہو سکتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بندوں کی تدبیر پر اپنی تدبیر کو غالب کرتا ہے، بندے ایک تدبیر کرتے ہیں۔ وہ بندوں کا مکر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسی تدبیر کو سبب بنا دیتا ہے ایک ایسے نتیجہ کا جو اس نتیجے سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کے لئے بندوں نے یہ تدبیر کی تھی اور جس پر وہ بہت نازاں تھے

عزیزانِ گرامی! یہ سنت اللہ ہے جس میں نہ کوئی فرق ہو سکتا ہے نہ تبدیلی اور سنت اللہ، یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی نصرت کرنے والے ہیں جو حق کی طرف ہیں جو عدل کی طرف ہیں وہ کامیاب ہوں گے جو ظلم کی طرف ہیں وہ بالآخر ناکام ہوں گے چاہے ہم کتنی چالیں چلتے رہیں خواہ کتنی کوشش کرتے رہیں نتیجہ ہمیشہ وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو یہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا قاعدہ رہا ہے اور اس قاعدے کو اس نے ہمیں بتا دیا ہے یعنی دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ حق کی نصرت کون کرتا ہے، دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون جنگ ہار رہا ہے اور کون جیت رہا ہے، یہ تو باتیں ہوتی رہتی ہیں تلک الایام نداولھا بین النّاس دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حق کی نصرت کون کر رہا ہے اور حق کے خلاف کون ہے۔

کون عدل کی طرف ہے اور کون ظلم کر رہا ہے اور جو عدل کی حمایت کر رہا ہے اور حق کی طرف ہے اور ظلم کو رد کر رہا ہے تو وہ غالب ہے اور اس کا ذکر قائم رہے گا اب یہ بات دیکھیں کہ دینِ اسلام کے اوپر جس وقت کہ وہ پھیلنا شروع ہوا تو کس کس طریقے کے حملے ہونا شروع ہوئے اور کس کس طریقہ کی مخالفتیں ہونی شروع ہوئیں تو ایک مخالفت تو وہ تھی کہ جو بدر کے اندر تھی ایک مخالفت وہ تھی کہ جو صفین کے اندر تھی، ایک مخالفت وہ ہوئی کہ جس کا نتیجہ صلحِ حسنؑ یا خلعِ خلافتِ حسنؑ ہوا اور ایک مخالفت ایک اختلاف یا ایک مکر کا نتیجہ وہ تھا کہ جو کربلا کے میدان میں ہوا یہ گویا مکر کی ایک داستان ہے کہ جو بدر سے شروع ہوتی ہے اور کربلا کے اوپر جا کر ختم ہوتی ہے۔ یہ دین کی مخالفت کا تسلسل اور لوگوں کے مکر کے پھیلاؤ کی داستان ہے اور اب تم اللہ تعالیٰ کی تدبیر دیکھو کہ کس طرح ان مخالفتوں اور اس مکر کی کوشش کے مقابلہ میں حق کو غلبہ حاصل ہوا اور دین کو فتحِ مبین کی بشارت ملی۔ اس موقع پر میں اگر تم کو فتحِ مبین کی تفسیر دیکھنا چاہتے ہو تو ان چار چیزوں کو یاد رکھ لو، بدر کو یاد رکھ لو، صفین کو یاد رکھ لو، صلحِ حسنؑ کو یاد رکھ لو اور کربلا کو یاد رکھ لو، یہی مل کر فتحِ مبین کی تفسیر کرتی ہیں اس لئے کہ انھیں کے اندر اسلام محفوظ ہو گیا اور اسلام کی قدریں جو تھیں تو وہ بھی محفوظ ہو گئیں، فتحِ مبین اس کو کہتے ہیں جس کے اندر محض ظاہری فتح نہ ہو بلکہ قدروں کی بھی فتح ہو، اصولوں کی بھی فتح ہو تو تم بدر سے شروع کرو اور کربلا تک آجاؤ وہ تمام کی تمام فتحِ مبین کی تفسیر ہو جائے گی وہ مکر ان لوگوں کا مکر اور یہ مکر اللہ، یہ اللہ تعالیٰ کا مکر یہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر کہ انھیں باتوں سے فتحِ مبین کی راہ ہموار ہوتی چلی جاتی ہے۔

اب جہاں تک کہ کربلا کا تعلق ہے عزیزانِ گرامی! آدمی کی کامیابی اور ناکامی دیکھی جاتی ہے اس مقصد سے کہ جو اس کے سامنے ہے تم اپنے معیار سے فیصلہ نہیں کر سکتے۔ امام حسینؑ کے عمل کو اپنے معیار سے دیکھنے کی غلطی مت کرنا۔ جناب امیر المومنینؑ کے متعلق بھی یہ باتیں کی جاتی ہیں، سیاست کا جہاں تک تعلق ہے ان کے مقابلہ میں معاویہ کامیاب ہو گیا یعنی سیاست میں جناب امیرؑ اتنے بڑے نہیں تھے جتنے کہ زندگی کے اور شعبوں کے اندر تھے

اس لئے کہ وہ اپنی حکومت پر مضبوط گرفت نہ رکھ سکے یا اس کو توسیع نہ دے سکے، پھر امام حسنؑ کے صلح حکومت کے متعلق بھی اسی قسم کی باتیں کی جاتی ہیں۔ تمہارے پاس بڑائی جانچنے کا اور کامیابی کو دیکھنے کا معیار یہ ہے کہ پُرجلال بادشاہ کون ہوا کس کی طاقت بہت رہی، کس کی حکومت نسل در نسل چلتی رہی، کس کی سولہ نسلیں بادشاہ رہیں تو یہ تمہارے پاس ایک معیار ہے لیکن کسی کا مقصد اگر یہ ہو کہ طوفان کا رخ بدل دے، ناخدا کی تو شان ہی یہ ہے کہ دریا جو ساحل چھوڑ کر چلا گیا ہے تو اسے پھر ساحل کی طرف لے آئے تو اگر کسی کا مقصد و جہد ہی یہ ہے کہ امت اسلام سے دُور ہٹ گئی ہے تو اس کو پھر میں اسلام کی طرف کھینچ کر لے آؤں اور اس کوشش کے اندر کسی قسم کی مصالحت گوارا نہیں ہو گی بلکہ میں ان کو بھولا ہوا سبق یاد دلا دوں اور یہ بات یاد دلا دوں کہ اسلام کی تعلیم کیا ہے تو پھر اس کو حق ہے کہ جب اس کی زندگی کے آخری لمحے پہنچیں تو کہے کہ ربِ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا اس لئے کہ نہ کوئی لالچ اس کو اس کے راستے سے ہٹا سکا نہ کوئی خوف اس کو اس کے راستے سے ہٹا سکا بلکہ جو مشورے اسے دیئے گئے خواہ وہ بدنیتی پر مبنی ہوں یا نیک نیتی پر ہوں تو ان مشوروں کو بھی اس نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا تو اسی طریقے سے اگر امام حسین علیہ السلام کا مقصد سلطنت حاصل کرنا تھا تو واقعی سلطنت حاصل نہیں ہوئی لیکن اگر امام حسین علیہ السلام کا مقصد اثباتِ حق تھا۔ حق کو قائم کرنا تھا، حق کی قدروں کو قائم کرنا تھا ہاں اس بات کی کوشش کی کہ اسلام کی قدریں اتنی محفوظ ہو جائیں کہ پھر کوئی ظالم و جابر بادشاہ ان کو مسخ کرنے کی کوشش کرے تو اس کی بداعمالیاں اس کی ذات تک محدود رہیں، دین کی روایت کو نہ بگاڑ سکیں۔ دنیا حکمران کے ذاتی عمل کو دین کی قدر نہ سمجھیں تو اگر یہ مقصد تھا تو اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے اس لئے کہ باطل اور حق اس طرح اور اس شان سے کبھی جدا جدا نہیں ہوئے تھے جیسے کہ کربلا میں ہوئے۔ اس لئے کہ محمد مصطفےٰ ہماری جانیں ان کے اوپر نثار ہوں خود انھوں نے یہ بات فرمائی ہے کہ لوگ ان کے ساتھ جہاد کو جاتے تھے اور لوگ اپنی مختلف نیتوں کے ساتھ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اجر ان کی نیتوں کے مطابق ہوتا ہے لیکن یہ وہ مقام ہے کہ جہاں نیتوں کے

اوپر کوئی شک نہیں ہو سکتا نہ خدا کو شک ہو سکتا ہے نہ اس کے بندوں کو شک ہو سکتا ہے تو جس طرح سے کہ حق و باطل کا فیصلہ جناب امام حسین علیہ السلام نے کیا تو اپنے اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب رہے اور اب اس مقصد کو سامنے رکھ کے یہ بھی بات سوچ لو کہ کیوں امام حسین علیہ السلام کے جو لشکری ساتھ ہوتے تھے تو اُن کو واپس کرتے چلے جاتے تھے اور کیوں یہ خاص بات تھی کہ ایک طرف لوگوں کو رخصت کیا جارہا ہے اور دوسری طرف کچھ لوگوں کو بلایا جارہا ہے۔

یا علیؑ میرے کچھ سمجھتا ہوں نصیری تجھکو کچھ
شک عقیدہ میرا اور انکا برابر ہوگیا ۔

کیوں مجھے نصیری تو اپنی سمجھتا ہے
میرے علیؑ تمہارا دیوانہ تو علیؑ کا بندہ ہے

پانچویں مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ پاک ہے اور بڑی برکت والا ہے وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، عرش و کرسی کا مالک وہی ہے، سورج، چاند اور ستارے اسی کے امر کی اطاعت کرتے ہیں، کائنات میں جتنے حادثات ہوتے ہیں جتنے واقعات ہوتے ہیں سب اسی کے اذن سے ہوتے ہیں، اسی کے امر سے ہوتے ہیں، وہ لوح و قلم کا مالک ہے، وہی رات میں سے دن نکالتا ہے دن میں سے رات نکالتا ہے، موت سے زندگی نکالتا ہے زندگی میں سے موت نکالتا ہے، حرکت اور تغیر کو اس کے اندر دخل نہیں ہے لیکن کائنات میں ہر حرکت اور ہر تغیر اسی کے امر سے ہوتا ہے وہ بڑی شان والا ہے ہر روز اس کی ایک نئی شان ہوتی ہے، کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاْنٍ تمام امور اس کے ارادے سے صادر ہوتے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ جاتے ہیں اور میں درود بھیجتا ہوں محمد مصطفےٰؐ پر جن کو اللہ نے ہدایت کے ساتھ بھیجا، امر کے ساتھ بھیجا اور ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ اس کی اطاعت کریں، اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور ہمیں بتایا گیا کہ جس نے اس کی اطاعت کی اس کے اوپر اللہ کی نعمتوں کی بارش ہوئی اور اللہ کی نعمت یہ ہوتی ہے کہ ایسا شخص انبیاءؑ اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی جماعت میں شامل ہوتا ہے۔ ہم سے یہ بات کہی گئی کہ اگر ہمیں اللہ کی محبت کا دعویٰ ہے تو اس دعوے کا واحد ثبوت یہ ہے کہ ہم اسکے رسولؐ کا اتباع کریں اور رسولؐ کے اتباع کرنے سے خدا ہم سے محبت کرنے لگے گا۔

اے لوگو! خدا کا حکم ہے کہ رسولؐ کا احترام کرو، رسولؐ کا اعزاز کرو، اس کی آواز پر اپنی آواز بلند مت کرو اس میں ایمان کے زائل ہونے کا خطرہ ہے، جو کچھ وہ دے اس کو لے لو جس بات سے منع کرے باز آؤ، اس رسولؐ کا فیصلہ اللہ کا فیصلہ ہے،

جب تمہارے امور کے اندر وہ فیصلہ کر دے تو اس کے بعد خود تمہارے امور میں تمہارا اختیار ختم ہو جاتا ہے، اور میر اسلام ہو ائمہ ہدیٰ پر جنھوں نے رسولؐ کا اتباع کیا اور ایسا اتباع کیا جو اتباع کا حق تھا اور اللہ کے رسولؐ نے اللہ کے اذن سے ان کو صاحب الامر مقرر کیا صاحب العصر مقرر کیا۔ صاحب العصر کون ہوتا ہے ؟ عزیزو! زمانہ ہر آدمی کا امتحان لیتا ہے ہر آدمی کا احتساب کرتا ہے۔ صاحب العصر وہ ہے جو زمانے کا امتحان لے اور زمانے کا احتساب کرے۔ زمانے کا اثر ہر شخص پر پڑتا ہے ہر شخص کو زمانہ کچھ نہ کچھ اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔ صاحب العصر اللہ کی مرضی کا تابع ہوتا ہے اور زمانے کو اپنی مرضی سے چلاتا ہے۔ زمانہ جسم ہے صاحب العصر روح ہے اور روح امرِ رب ہوتی ہے۔

عزیزانِ گرامی! کل کی صحبت میں جو مضمون تھا تو وہ یہ تھا کہ قوموں کا عروج وزوال ہوتا رہتا ہے، یہ تداولِ ایّام جاری رہتا ہے، یہ دن پھرتے رہتے ہیں کبھی کسی کا دن ہوتا ہے کبھی کسی کا دن ہوتا ہے، کوئی ہارتا ہے، کوئی جیتتا ہے لیکن ان تمام حوادث اور واقعات میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ کی نصرت کون کر رہا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عدل کے اوپر اور حق کے اوپر کون ہے اور ظلم کے اوپر اور باطل کے اوپر کون۔ یہ فیصلہ کن بات اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بھی ہوتی ہے یہی معیار ہے کہ جس سے ہر واقعے کی اہمیت کو جانا جاتا ہے، اگر یہ بات نہیں ہے تو وہ واقعہ کتنے ہی شان وشوکت رکھنے والے ہوں کتنے زیادہ دنیا کے اندر دھاکہ پیدا کرنے والے ہوں، اللہ اور اللہ کے فرشتوں کی نگاہ میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ کلامِ پاک کے اندر مختلف مطالب اور مضامین ہیں۔ ان مضامین کی تقسیم کچھ اس طرح ہے کہ ایمان اور عقیدے کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد دلا کے نصیحت کی گئی ہے، ایّام اللہ یعنی تاریخ کے تغیر و حرکت کا ذکر کر کے قوموں کے عروج وزوال کی حکایت بیان کر کے لوگوں کی نصیحت کی گئی ہے، اور موت اور قیامت کا ذکر کر کے نصیحت کی گئی ہے، یہ گویا ایک سطحی سی تقسیم ہے کلامِ

پاک کے مضامین کی، اب ذرا اس بات کے اوپر غور کریں کہ ایمان اور عقیدے کے اندر تو تمام کے تمام اصولِ دین آگئے اب ان کی اور تفصیل کے لئے جہاں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر ہوتا ہے وہ اس کی ربوبیت کی شان ہے، اس کی رحیمی کی شان ہے، وہ اس کی رحمانیت کی شان ہے وہ توحید کا ایک حصہ ہے، جہاں اس کے احکام کا ذکر ہے تو جس کے ذریعے سے احکام پہنچے اور جن کے سپرد ان احکام کی حفاظت کرنا اور آگے بڑھانا اور ان کی تبلیغ کرنا ہے، گویا نبوت اور امامت تو وہ اس کے اندر آگئے اور موت اور قیامت کے ذکر میں ہمارے اصولِ دین میں سے ایک دوسرا اصول گویا قیامت جو ہے تو وہ آگئی اور یہ جو تذکیر بیانیہ بایام اللہ ہے، یہ جو واقعات کا ذکر کیا جا رہا ہے اور یہی اس کے ذریعے سے نصیحت کی جا رہی ہے اس کے اندر رب العزت کا عدل آگیا، کس طرح سے سزا دی جاتی ہے، کس طرح سے جزا دی جاتی کن باتوں سے قومیں آگے بڑھتی ہیں، کن باتوں سے قوموں کو زوال آتا ہے تو گویا اس طرح سے تمام کے تمام کلامِ پاک میں دین کے اصولوں یعنی توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت کا بیان پھیلا ہوا ہے، کوئی مضمون ان پانچ اصولوں سے باہر نہیں ہے، دین کے یہ اصول کلامِ پاک کے مضامین ہی سے اخذ کئے گئے ہیں اور کلامِ پاک کے مضامین انہی اصولوں کے بیان اور ان کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہیں۔

عزیزانِ گرامی! اب یہ بات یعنی قوموں کا عروج و زوال، کسی کی شکست کسی کی فتح، کبھی کسی کا دن ہونا کبھی کسی کا دن ہونا، یہ بات آدمیوں کی اور سوچنے والوں کی توجہ کو ہمیشہ اپنی طرف مبذول کرتی رہی ہے اس لئے کہ اس زمین پر کیا کیا تہذیبیں پیدا ہوئیں وہ تہذیبیں کیسے عروج کو پہنچیں، دولت، علم اور طاقت کے اعتبار سے کس عروج کو پہنچیں، کیا ان کی دولت، ان کا علم کیا ان کی انھوں نے کس قدر ترقی کی اور پھر کس طریقہ سے وہ زوال پذیر ہوگئیں، کس طریقے سے وہ ختم ہوگئیں ایک بڑی زبردست طاقت کا عروج اور زوال تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے کہ کبھی یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ مغرب کا تسلط ختم بھی ہو سکتا ہے یعنی وہ سلطنتِ

برطانیہ جس کے اقتدار کی حد میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا اس کے اقتدار کا سورج خود ڈوب گیا تو یہ بات ہمیشہ سوچنے والوں اور سمجھنے والوں کی توجہ ہمیشہ اپنی طرف جذب کرتی رہی ہے کہ آخر تاریخ کے واقعات کو تاریخ کے حادثات کو سمجھنے کی کنجی کیا ہے، ان واقعات کو کس طرح سمجھا جائے، آخر ان کے پیچھے کوئی معنی ہیں، کوئی مطلب ہے، کوئی سلسلہ ہے، کوئی ان کا راز ہے یا یہ تمام کے تمام
محض حادثات ہیں اور تاریخ صرف حادثات کا ایک ڈھیر ہے۔ تو تمام سوچنے والے انسانوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو جاتی ہے اس لئے کہ دنیائیں دو ہی ہیں۔ ایک عالم عالم فطرت ہے، ایک عالم تاریخ ہے تو ظاہر ہے عالم تاریخ کی طرف لوگوں کی توجہ کا مبذول ہونا ایک لازمی اور فطری عمل ہے، انسان کے دماغ کا ایک تقاضہ ہے۔

مختلف لوگوں نے تاریخ کو مختلف طریقے سے سمجھا ہے، ایسے بھی لوگ ہیں کہ جو یہ بات کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ یہ تاریخ جو ہے یہ حوادثات کا ایک مجموعہ ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جو یہ بات نہیں سمجھتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی امر اللہ کا تھا اور اس کے بعد بھی امر اللہ کا ہے، جتنی بھی حرکات اور جتنا بھی تغیر چاروں طرف ہے تو اس میں اللہ کا امر کام کر رہا ہے تو اس بات کو وہ نہیں سمجھتے، تاریخ کو سمجھنے کا ایک نظریہ یہ پیش کیا گیا کہ زمین کے مختلف خطے ہیں، ان کے مختلف جغرافیائی ماحول ہیں تو جغرافیائی ماحول کا اثر قوموں کے اوپر ہوتا ہے اور ان قوموں کی سیرت اور ان قوموں کی تاریخ، ان قوموں کی تہذیب تمام کی تمام اسی جغرافیائی ماحول کی تابع ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے مکتب فکر نے یہ بات کہی کہ تاریخ کو اس طریقے سے سمجھیں کہ بادشاہ ہوتے ہیں، بادشاہ حکومتیں کرتے ہیں، سلطنتیں قائم کرتے ہیں، کوئی بادشاہ اچھا ہوتا ہے کوئی بُرا ہوتا ہے۔ سیاسی اداروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ فلاں بادشاہ نے یہ بے وقوفی کی تو سلطنت ختم ہوگئی تو اس طریقے سے تاریخ کا ایک نظریہ یہ ہوا کہ وہ سلطنتوں کا قصہ جو ہے تو وہ بیان کیا جائے، بادشاہوں کا قصہ بیان کیا جائے جو سماجی ادارے ہیں تو ان کا قصہ بیان کیا جائے۔
یہ مختلف نظریات اس بات کے شاہد ہیں کہ کس طرح یہ مضمون اور یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ

جس کے متعلق لوگ غور و خوض کرتے رہے ہیں اور کوئی نہ کوئی اس کی کنجی اور کوئی نہ کوئی اس کا راز، اور کوئی نہ کوئی اس کا قانون دریافت کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں، پھر ایک بات یہ کہی گئی کہ تمام کی تمام تاریخ کیا ہے، تاریخ جو ہے تو وہ جو بڑے آدمی ہوتے ہیں، جو ہیرو ہوتے ہیں تو اُن کی سوانح عمریاں ہیں، اگر بڑے آدمی کی سوانح عمریاں لکھی جائیں تو وہی دنیا کی تاریخ ہو جائے گی، ایک بڑا آدمی ظاہر ہوتا ہے وہ کچھ کرتا ہے اس کے جو کچھ کارنامے ہیں اس کی داستان بیان کرو تو یہ تمام دنیا کی تاریخ ہو جائے گی۔ میں یہاں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں خاص طور پر ان لوگوں کے نام لوں کہ جن کے ساتھ یہ نظریات وابستہ ہیں) اور زیادہ گہرے گئے تو ایک تاریخ کا حل اور تاریخ کو سمجھنے کا راز یہ کہا گیا کہ یہ تمام کی تمام باتیں پیداوار کے طریقوں پر منحصر ہوتی ہیں جب جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف آئیں تو مذہب بھی بدل جاتا ہے، لوگوں کے طور طریقے بھی بدل جاتے ہیں، زندگی کے مقاصد بھی بدل جاتے ہیں جس وقت کہ سرمایہ داری سے اشتراکیت کی طرف آئے اور نظامِ پیداوار بدلا اور پیداوار کے رشتے بدلے تو اس وقت ایک دوسرا اخلاق کا نظام آجاتا ہے مذہب بدل جاتا ہے، مقاصد بدل جاتے ہیں۔ گویا تمام کی تمام تاریخ کو سمجھنے کی کنجی طریقِ پیداوار کے اندر ہے اور وہ طریقِ پیداوار انسانوں کے قلوب اور اذہان کو متاثر کرتے ہیں۔ انھیں کے لحاظ سے ان کا مذہب بن جاتا ہے، انھیں کے لحاظ سے ان کے اخلاق بن جاتے ہیں، انھیں کے لحاظ سے زندگی کے مقاصد بن جاتے ہیں تو یہ ایک نظریہ جو تاریخ کے سمجھنے کا ہے تو وہ پیش کیا کیا گیا، پھر ایک نظریہ تاریخ کو سمجھنے کا نفسیاتی ہوا اور وہ یہ ہوا کہ انسان کی جبلت کے اندر کچھ خصوصیتیں ہوتی ہیں ان کا ذکر کرنا بیکار ہے بہرحال ایک خصومت کو دبایا جائے اور دوسری خصومت کو ابھارا جائے اور کس خصومت کو دبایا جا رہا ہے اور کس خصومت کو ابھارا جا رہا ہے تو اسی سے تہذیب کا رنگ قائم ہوتا ہے اور تہذیب کا کیرکٹر قائم ہوتا ہے گویا اگر کسی قوم کی تہذیب کو سمجھنا ہے اور اس کے عروج و زوال کو

سمجھنا ہے اور اس کے کیرکٹر کو سمجھنا ہے تو ہمیں جماعت
کے نفسیات کے اندر گہرا اترنا پڑے گا اور یہ دیکھنا پڑے گا کہ فطرت کے کونسے داعیات
کو ابھارا جا رہا ہے اور کون سے داعیات کو دبایا جا رہا ہے، تو یہ ایک طریقہ ہے تاریخ
کو سمجھنے کا۔ اس کے علاوہ یہ بات بتائی گئی کہ ایک آئیڈیا ہوتا ہے اور اس کے مقابل
میں دوسرا آئیڈیا ہوتا ہے پھر ان دونوں کے اندر ہم آہنگی ہو جاتی ہے پھر وہ جو ہم آہنگ
شدہ آئیڈیا ہے تو اس کی مخالفت ہوتی ہے تو اس کی مخالفت ہوتی ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ
یہ تہذیبیں اور یہ قوموں کا عروج و زوال یہ تو بالکل اسی طریقے سے ہے کہ جیسے ایک انسان
کی عمر ہوتی ہے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے پھر جوان ہوتا ہے اس کے بعد اس کا بڑھاپا آتا ہے،
بڑھاپے کے بعد وہ مر جاتا ہے۔ تو یہی کیفیت تہذیبوں کی ہے، تہذیبیں پیدا ہوتی ہیں
پلتی ہیں بڑھتی ہیں، شباب اور عروج کے اوپر پہنچتی ہیں لیکن چونکہ کائنات کی ہر چیز
کو زوال ہے اس عروج کے بعد زوال ہے تو اسی طریقے سے ان تہذیبوں کو بھی زوال
آجاتا ہے اور بالآخر یہ تہذیبیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ دوسری تہذیبیں
لے لیتی ہیں تو یہ بات جو تھی تو یہ کہی گئی اور یہ بات کہی گئی کہ ہر قوم کے سامنے زمانے
کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جب تک وہ قوم اس زمانے کے تقاضوں کا جواب دے
رہی ہے اور اس کے اندر اتنی صلاحیت اور اس کے اندر اتنی نظر اور اتنی طاقت ہے
کہ وہ زمانے کے تقاضوں کا جواب دے سکے تو اس وقت تک وہ زندہ رہتی ہے اور
جس وقت کہ قوم زمانے کے تقاضوں کا جواب دینے سے عاجز ہو جاتی ہے یا جواب
کمزور ہوتا ہے تو اس قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے، اگر اس قوم کے اندر اتنی سمجھ
اور اتنی حکمت اور اتنی جرأت اور ہمت رہے تو جیسے جیسے زمانے کے تقاضے پیدا ہوتے
چلے جا رہے ہیں وہ ان کا مناسب جواب دیتی چلی جائے تو وہ قوم زندہ رہے گی اور
اسی وقت تک یہ زندگی رہتی ہے جب تک وہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھتی ہے اور
ان کا مناسب جواب دیتی ہے، یہ میں نے آپ کے سامنے تاریخ کو سمجھنے کے اور قوموں
کے عروج و زوال کو سمجھنے کے متعلق مختلف نظریات جو انسانی ذہن نے وضع کئے ہیں

وہ بہت اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں تاکہ پس منظر آپ کے سامنے آجائے کہ انسان کا دماغ کس طرح سے اس نظریہ میں الجھا رہا ہے کہ کیوں قومیں عروج کو پہنچتی ہیں کیوں قوموں کا زوال ہوتا ہے، یہ آخر کیا راز ہے؟ کیا ہمارے پاس اس تالے کو کھولنے کیلئے کنجی ہے یا نہیں ہے، کوئی اس مسئلے کو سمجھنے کا قانون ہے کہ نہیں ہے تو اس کو سمجھنے کے اندر انسان کا دماغ الجھتا رہا ہے اور وہی انسانی دماغ کی الجھن ہے، میں نے آپکے سامنے پیش کیں کہ لوگوں نے کیا کیا جواب دیئے ہیں اور ہر نظریہ جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اس کے ساتھ علم تاریخ کے جو بہت بڑے نام ہیں تو ان کی وضاحت یہاں ضروری نہیں۔

عزیزانِ گرامی! کلامِ پاک کے اندر بھی یہ تاریخی واقعات موجود ہیں، یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ کلامِ پاک جو ہے تو وہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے یہ تو جو کلامِ پاک کے مقام کو نہیں سمجھتے تو وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ کلامِ پاک سائنس کی کتاب ہے، تاریخ کی کتاب، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ ان تمام علوم کو سمجھنے کی کنجی اس کے اندر ضرور موجود ہے، علم کا کوئی سا شعبہ ہو کلامِ پاک کے اندر اس کو سمجھنے کی کنجی موجود ہے، اور یہ بات کہ کلامِ پاک کے اندر سائنس موجود ہے اور کلامِ پاک میں طبعی کلیات ہیں، یہ تمام کی تمام باتیں ان لوگوں کی ہیں کہ جنھوں نے کلامِ پاک کے اندر غور نہیں کیا، اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ اطلاعات سائنسی یا تاریخی اگر موجود ہیں تو اُن کی بڑی زبردست اہمیت ہے، گویا کہ یہ بات قرآن میں مل جائے کہ سورج اپنی جگہ ہے اور زمین چاروں طرف گردش کرتی ہے تو وہ بہت بڑی بات کہی گئی ہے، اور اس کے بعد یہ صورت بھی چل رہی ہے کہ جہاں کوئی .. ..
سائنسی تحقیق وانکشاف ہوا، جہاں کوئی بات دریافت کی گئی تو اب یہ دعویٰ شروع ہوگیا کہ یہ بات ہماری کتاب کے اندر موجود ہے اور آیتوں کو توڑ مروڑ کے اس سے وہی معنی نکالنے شروع کر دیئے، ان بھلے آدمیوں سے کوئی یہ پوچھے کہ کیا یہ سائنس کی دریافت ہونے کے پہلے آپ کی کتاب نہیں تھی، آپ نے اس سے پہلے کیوں نہیں

بتایا کہ کتاب کے اندر یہ بات موجود ہے، سائنس کی دریافت ہونے کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ کتاب کے اندر یہ بات موجود ہے، غرض یہ بات تو یونہی چلتی رہتی ہے، اتنی بات ضرور ہے کہ ... ... ہر علم کی حقیقت کو سمجھنے کی کنجی ضرور کلام پاک کے اندر موجود ہے، چنانچہ آپ یہ بات دیکھیں کہ تاریخ کو سمجھنے کے متعلق یہ تمام کے تمام نظریات جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے تو ان کے اندر کا ذکر کہیں نہیں آتا ہے اس لئے کہ سائنٹفک اسٹیڈی کی تو خصوصیت ہی یہ ہے کہ اللہ کو ایک طرف رکھا جائے اس کے بعد تمام کے تمام واقعات وحوادث کو سمجھنے کی کوشش کی جائے حالانکہ مذہب کی اوّلین تعلیم یہی تھی کہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے، اللہ تعالیٰ کا منشا رہے ___ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے وہ جسے چاہے بڑھاتا ہے جس کو چاہے گھٹاتا ہے۔ عزیزو! میں آپ سے ایک بات عرض کروں کہ ہمارے زمانے کے بھی کچھ حکماء اور مفکر یہ بات کہتے ہیں کہ تاریخ ایک قوم کے اپنے خدا سے تعلق کا نام ہے گویا تاریخ کے اندر آپ یہ دیکھیں گے کہ یہ قوم کس خدا کی پرستش کرتی ہے، قوم کے تمام مقاصد اور تمام ارادے اور تمام زندگی کا فلسفہ وہ تمام کا تمام آپ کی سمجھ میں اس وقت آئے گا کہ جب آپ یہ دیکھیں کہ یہ قوم کس خدا کی پرستش کرتی ہے کس خدا کی عبادت کرتی ہے، اور یہ بات دیکھنے کے ساتھ ہی پھر آپ یہ دیکھیں کہ اس قوم کے اس خدا سے تعلقات کیا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا اور اس قوم کے باہمی تعلق کا نام ہی تاریخ ہے۔ یہ بھی ایک مفکر کی بات ہے جو میں نقل کر رہا ہوں۔

تو گویا صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اختیار دیا، اختیار کے معنی یہ ہوئے کہ اگر وہ چاہیں تو خدا کے دوست بن جائیں، اگر وہ چاہیں تو خدا کے دشمن بن جائیں اور پھر یہ بھی کہا گیا کہ یہ دیکھو کہ ہم نے انسان کو کس طرح پیدا کیا اور پھر وہ خصم مبین بن گیا ہے، بالکل کھلم کھلا دشمن بن جاتا ہے تو وہ اللہ سے

دوستی بھی کر سکتا ہے، اللہ سے دشمنی بھی کر سکتا ہے اور اللہ کے ساتھ منافقت بھی برت سکتا ہے، یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں اللہ کی پرستش کرتا ہوں اور خدا جانے کون سے خداؤں کی پرستش شروع کر دیتا ہے، کوئی سونے کا بچھڑا ہو اس کی پرستش کی جارہی ہے یا کوئی فرعون کا آستانہ ہو اس کی پرستش کی جارہی ہو اس لئے کہ پرستش کرنے کے اور عبادت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنی تمام امیدوں اور تمام خوف کو اس ذات سے وابستہ کرے اور اس بات کا اس کے دل کے اندر یقین ہو کہ موت اور زندگی کا اختیار اور نفع اور ضرر کا اختیار صرف اسی کو ہے جس ذات کے متعلق آپ یہ سمجھتے ہوں کہ حقیقی معنوں میں حاکم وہی ہے، زندگی اور موت کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہے، وہی آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے، وہی آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے وہی آپ کو نفع پہنچا سکتا ہے اور اس کے علاوہ دنیا میں اور کوئی شئے ایسی نہیں ہے، اور کوئی ایسی ذات نہیں ہے کہ جس سے آدمی اپنی امیدوں کو وابستہ کرے اور جس سے خوف کرے، تو عزیزو اسی کو خدا کہا کرتے ہیں وہی حقیقت میں خدا ہے جیسا کہ میں نے اپنی تقریر میں عرض بھی کیا تھا اور وہ امام حسن عسکری علیہ السلام کا قول ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں کہ لوگو دیکھو تو تمھاری مجبوریوں میں، تمھاری ضرورتوں میں اور تمھاری تنہائیوں میں جس کی طرف تم رجوع کرتے ہو اس وقت کہ جب مایوسیاں چاروں طرف سے تمھیں گھیر لیتی ہیں اور جب تمھارے سارے اسباب منقطع ہو جاتے ہیں تو اللہ اسی کا نام ہے جب تم ایسے وقت میں جس کی طرف رجوع ہوئے ہو تو اس کو اللہ کہتے ہیں، وہ اللہ ہوتا ہے تو گویا یہ بات دیکھنی ہے کہ یہ قوم کس کی عبادت کرتی ہے اور یہ بات دیکھنی ہے کہ اس قوم کے اپنے خدا سے کیا تعلقات ہیں، اس بات کو اگر آپ دیکھیں اور اس کنجی کو اگر آپ اپنے پاس رکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کلامِ پاک کے اندر جتنے قصص بیان کئے گئے ہیں تو وہ سب کے سب اسی نقطۂ نگاہ سے بیان کئے گئے ہیں کہ وہ لوگ کس اللہ کی پرستش کرتے تھے، کس اللہ کی عبادت کرتے تھے، اس سے کس طرح سے عہد باندھا تھا، اس کی کس طریقے سے خلاف ورزی

کی کس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے دولت دی سلطنت دی ان کو تمام دنیا کے اوپر بڑائی دی، پھر کس طریقے سے ان باتوں کے ختم ہونے سے کس طریقے سے اسی عہد شکنی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو بگاڑنے کی وجہ سے ان قوموں کا زوال ہوگیا۔ کلام پاک کے اندر ان تمام باتوں کا ذکر موجود ہے، یعنی آپ یہ دیکھیں کہ حضرت آدم سے شروع کیا گیا ہے جب انسان انسان بنا، اس کے بعد حضرتِ نوحؑ تک ایک عہد آیا، پھر جناب ابراہیمؑ کا دور شروع ہوتا ہے تو آپ دیکھیں مختصراً جو تصویر بیان کی گئی ہے، جناب ابراہیمؑ کا بابل کے اندر پیدا ہونا، وہاں کی تہذیب، وہاں کا طریقہ، نمرود کی حکومت، ان کا نمرود کی خدائی سے انکار کرنا، ان کی تلاشِ حق کہ جو آسمان کی طرف دیکھتے اور سورج اور چاند کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر آفلین یعنی ڈوبنے والوں سے اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں اور پھر اس معاشرے سے جو باطل پرستی کی وجہ سے ابراہیمؑ کا بالکل مخالف ہوگیا تھا، تو اس معاشرے سے ہجرت کی سنت کو قائم کرنا، ان سے اپنی پیٹھ موڑ کے، ان تمام کے اوپر تبرّا کر کے، ہجرت اختیار کرنا اور کنعان کی طرف تشریف لے جانا، کنعان میں ان کا تمکن اور پھر اللہ تعالیٰ کے مصلحت سے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک وادیِ غیر ذی زرع کے اندر پہنچنا وہاں کعبہ کی تاسیس کو مضبوط کرنا اور وہاں ان کا امتحان ہونا کچھ کلمات سے، ان کلمات کے اندر ان کا پورا اترنا اور اللہ تعالیٰ کا ان کو امام بنانا، بنی اسماعیلؑ ہوں یا بنی اسحاقؑ دونوں سلسلے انہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ یہ تمام کے تمام واقعات ہمیں بتائے گئے، پھر ہمیں یہ بات بتائی گئی کہ کنعان سے کس طرح سے جناب یوسفؑ مصر کے اندر پہنچے اور پھر کس طریقے سے بنی اسرائیل مصر کے اندر رہنا شروع ہوئے، پھر وہیں مصر کے اندر کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرتِ یوسفؑ کو تمکن عطا کیا تھا بنی اسرائیل جو تھے تو وہ غلامی کی زندگی بسر کرنے لگے، ایک عروج کے بعد پھر وہ زوال ہوا، پھر ان پر اللہ تعالیٰ نے رحم کیا اور ان کے اندر جناب موسیٰؑ پیدا ہوئے، جناب موسیٰؑ کی تربیت خود فرعون کے گھر ہوئی اور ایک بہانے سے ایک سبب پیدا ہونے سے کہ ان کے ہاتھ سے ایک قبطی مارا جاتا

ہے وہ جنگل کے اندر جاتے ہیں، صحرا کے اندر جاتے ہیں، پھر ایک خاص وقت پر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ موسیٰ تم فرعون کی طرف جاؤ، اور جنابِ موسیٰؑ کو برکت ان کی قیادت وہدایت سے اسی قوم بنی اسرائیل کو کہ جو غلاموں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے فرعونِ مصر کے ظلم سے نجات ملی، اس نجات ملنے کے بعد اب چالیس برس تک بیابانوں کے اندر پھرتے رہتے ہیں تو وہ تمام کے تمام واقعات کلامِ پاک کے اندر موجود ہیں کہ کس طرح سے یہ لوگ جناب موسیٰؑ کو تنگ کرتے تھے اور کس طرح سے جنابِ موسیٰؑ ہمیشہ ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف کھینچتے تھے اور پھر یہ پیچھے کی طرف جاتے تھے اور کس طرح سے، جناب موسیٰؑ کی زندگی میں تو ملک نہیں ملا لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ملک دیا، ان کے اندر بڑے بڑے بادشاہ پیدا ہوئے، ان کے اندر بڑے بڑے انبیاء پیدا ہوئے، ان کے اندر جناب داؤدؑ پیدا ہوئے، ان کے اندر جنابِ سلیمانؑ پیدا ہوئے، اتنے بڑے بڑے بادشاہ پیدا ہوئے، انبیاء اور ملک انکے اندر ہوتے رہے، پھر اس کے بعد ان کے اندر ایک انتشار پیدا ہوا، آپس میں لڑائیاں انھوں نے شروع کیں تو پھر بابل کا ایک بادشاہ بختِ نصر ان کو قید کر کے لے گیا پھر تھوڑے عرصہ کے بعد جب ایران کا بادشاہ سائرس نے اسیریا والوں کو ہرا دیا تو ان کو رہائی نصیب ہوئی اور پھر یہ لوگ وطن لوٹے، پھر جناب عیسیٰؑ کی بعثت ہوئی جناب عیسیٰؑ کا ان لوگوں نے انکار کیا تو جناب عیسیٰؑ کا انکار کرنے کے بعد دوبارہ ذلت اور مسکنت سے دوچار ہوئے، رومن حاکموں نے یروشلم کو تباہ کیا، یہ تمام کے تمام قصے اور یہ تمام کے تمام اشارے کلامِ پاک کے اندر موجود ہیں اور کلامِ پاک کے اندر موجود ہیں اور کلامِ پاک کے اندر جنابِ حضورؐ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جتنے بھی اہم واقعات ہیں تو وہ سبھی موجود ہیں، اصحاب کی طرف جو اشارہ ہے تو وہ بھی موجود ہے، آپ کی ہجرت کا بھی ذکر ہے، بدر کا بھی ذکر ہے، احد کا ذکر بھی ہے، خندق کا ذکر بھی ہے، صلح حدیبیہ بھی ہے، مباہلہ کا بھی ذکر ہے، الوداعی خطبے اور وصیت کا ذکر بھی ہے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے اندر کی جو

باتیں تھیں تو ان تک کا ذکر کلامِ پاک کے اندر موجود ہے۔

اچھا اب سلسلۂ کلام کو بڑھانے سے پہلے میں یہ بات عرض کر دوں کہ اگر کلامِ پاک کی ان آیات کے اوپر غور کر کے ہم یہ دیکھنا شروع کریں کہ بنی اسرائیل سے کیا شکایت ان کے (اور ہمارے) خدا کو پیدا ہوئی۔ ان کا کیوں زوال ہوا تو کلامِ پاک میں جو باتیں جستہ جستہ ملتی ہیں تو کچھ اس طرح ہیں کہ یہ لوگ آزادی سے جنگل کے اندر پھر رہے تھے، وہاں من وسلویٰ ان کے اوپر اترتا تھا، من وسلویٰ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آزادی کی خوراک تھی، وہ آزادی کا کھانا تھا، یہ جو تھے تو ـــــ مختلف اقسام کے جو کھانے ہوتے ہیں تو وہ چاہتے ہیں چاہے اس کی کچھ ہی قیمت ادا کرنی پڑے، چاہے اس کی قیمت یہ ادا کرنی ہو کہ دوسروں سے بھیک مانگنی پڑے یا دوسروں کا غلام بننا پڑے۔

عزیزانِ گرامی! ایک چھوٹی سی بات ہے مگر اس بات کو سمجھیں کہ اس کو ہم چھوٹی بات نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ یہ قرآنی آیت بن گئی ہے اور قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ حقیقت ابدی ہے، آزادی کے اندر جب سختیاں ہوتی ہیں تو اکثر وہ قوم جو کمزور ہوتی ہے اس سختی سے اور اس ایک ہی کھانے کے اوپر قناعت کرنے سے گھبرا کے دوسری قوموں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہے اور اس کے معاشی امداد کے بدلے میں خود اس کا غلام بننا چاہتی ہے، یہ ایک اہم نکتہ کلامِ پاک کے اندر بتلایا گیا ہے، یہ ان لوگوں سے کہا گیا ہے کہ جب بھی تم شہر کے اندر داخل ہو تو حِطّہ کہتے ہوئے داخل ہو، حِطّہ اللہ تعالیٰ کی بخشش کی اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا ہے، ان لوگوں نے کیا کیا، ان لوگوں نے اس تمسخر کے اندر اس حطّہ کو بدل کے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بدل کے انھوں نے حنطہ کر دیا، حنطہ کے معنی ہیں گیہوں یعنی اللہ تعالیٰ تو یہ کہہ رہا ہے کہ میں تمھیں تمکن دے رہا ہوں۔ اس زمین کو تمھارا وطن بنا رہا ہوں، تو تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو اور جس طرح سے تمھارے اوپر تباہی آئی، ان باتوں کو یاد کرو اور جس طرح سے تمھارے اوپر تباہی آئی، ان باتوں کو یاد کرو اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو اور ان باتوں سے توبہ کرو کہ جن باتوں سے تباہی

آئی مگر لوگوں کو اس بات کی فکر ہے کہ یہ مالِ غنیمت جو ملنے والا ہے اس کو جتنا بھی لوٹا جا سکے اس کو لوٹ لو، وہ تمام کی تمام بخشش اور معرفت اپنی جگہ ہے لیکن جتنا جی بھر کے گیہوں ذخیرہ کر سکو تو وہ کر لو، تو کلام پاک کے اندر بنی اسرائیل کی یہ بات بھی بیان کی گئی اور یہ بات بیان کی گئی کہ جناب موسیٰؑ انہی لوگوں کی ہدایت کے لئے، ایک شریعت لینے کے لئے، ایک قانون لینے کیلئے گئے تاکہ اس قوم کی تاسیس کی جا سکے، اس قوم کی بنیاد مضبوط کی جا سکے، وہ کچھ دن کے لئے لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہوتے ہیں، ہارونؑ کو اپنا خلیفہ بنا کے جاتے ہیں اور لوگوں کو یہی ہدایت کرتے ہیں کہ ہارونؑ کی بات ماننا مگر ہارونؑ کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہوتا ہے کہ جتنے بھی زیورات اور جتنے بھی سونے کی چیزیں لے کے آئے تھے انھیں پگھلا کے ایک بچھڑا بنایا جاتا ہے اور اس سونے کے بچھڑے کی پرستش شروع ہو جاتی ہے اور ہارون جو ہیں تو وہ کہتے رہتے ہیں کہ لوگو میری اطاعت کرو، میرا اتباع کرو مگر لوگ تو اُن کی کوئی بات ہی نہیں سنتے۔ اور کلام پاک کے اندر یہ بتایا گیا ہے کہ سونے کے بچھڑے کی پرستش ان کے دلوں کے اندر رچ گئی تھی گویا حقیقی خدا یعنی رب موسیٰؑ وہارونؑ کے مقابلے میں سونے کے بچھڑے کو خدا بنالیا اور لوگ خدائے موسیٰؑ کو چھوڑ کے سونے کے بچھڑے کی پرستش کرنے لگے، یہ تمام کی تمام باتیں بنی اسرائیل کی قوم تک محدود نہیں ہیں، یہ روشن آیات ہیں، یہ تو ہمارے اور تمھارے سامنے کی بات ہے کہ کس طرح سے سونے کے بچھڑے کی پرستش کی جاتی ہے، کس طرح سے خدائے موسیٰؑ و محمدؐ کو بھلایا جاتا ہے اس کی طرف سے اپنی پیٹھ کی جاتی ہے، اور سونے کے بچھڑے کی پرستش میں لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔
اس لئے وہ سونے کا بچھڑا جو بنا تھا تو وہ تھا بہت خوبصورت، یہ دوسری بات ہے کہ اس میں سے کوئی آواز نہیں نکلتی تھی، وہ دیکھنے میں بڑا خوبصورت تھا اور اس خوبصورتی کی وجہ سے لوگوں کے دل جو تھے تو وہ اس کی طرف رجوع ہوتے تھے تو سونے کے بچھڑے کی پرستش بنی اسرائیل نے بھی کی اور دیگر تمام کی تمام قومیں جو

ہیں تو وہ بھی خدائے موسیٰؑ و خدائے محمدؐ کی پرستش چھوڑ کے اس سونے کے بچھڑے کی پرستش کرنے لگتی ہیں ۔

کلام پاک میں بنی اسرائیل کے متعلق مزید یہ کہا گیا کہ جو تعلیم ان کو جناب موسیٰؑ فرماتے تھے ، اس کی بنیادی اور اہم باتوں کو چھوڑ کے وہ ، چھوٹی چھوٹی باتوں کا تجسس کیا کرتے تھے ، جب جناب موسیٰؑ کوئی حکم دیتے تو بجائے اس کے کہ وہ جناب موسیٰؑ کے حکم کی اطاعت کریں بال میں سے کھال نکالنا شروع کر دیتے ۔ چھوٹی چھوٹی باتیں نکالنا کہ آپ یہ تو بتائیں کہ وہ گائے کس رنگ کی ہو گی ، اس گائے کی عمر کیا ہو گی کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے تو ایسی باتوں کے متعلق حضور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ لوگو اس طریقے سے تنگ مت کیا کرو جس طرح سے کہ جناب موسیٰؑ کی امت ان کو تنگ کیا کرتی تھی ، جو اصل امر ہے اس کو پکڑے رہو ، تنازع فی الامر مت ہونے دو ، اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو ، یہ چھوٹی چھوٹی باتیں یہ جو تجسس تم کرتے رہے ہو اور ان چھوٹی باتوں کو تم الامر کی جگہ دے رہے ہو تو یہ باتیں تمھیں تباہ کرنے والی ہیں تو بنی اسرائیل کی یہ خصوصیت بتائی گئی ، اور بنی اسرائیل کی یہ بھی خصوصیت بتائی گئی کہ یہ لوگ اتنا تکبر کرنے لگے کہ نحن ابناء اللہ کے مدعی ہو گئے ، ان کا خیال تھا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور پسندیدہ (CHOSEN) بندے ہیں ، اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے ہمارے اوپر ، ہمارے گناہ جو ہیں تو وہ بھی بالکل معاف ہو جائیں گے ، یہ وہی بات ہے جس سے عدل کی نفی لازم آتی ہے گویا اپنے آپ کو منتخب قوم (CHOSEN) سمجھنا ، اس بات کو دیکھے بغیر کہ جو عہد اللہ تعالیٰ کا آپ سے ہوا ہے اس کو آپ پورا کر رہے ہیں یا نہیں یہ بات سمجھنا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اور ہر مغفرت کے سزاوار ہیں تو یہ بات جو تھی تو یہ بھی ان میں ہو گئی اور یہ بات مسلمانوں میں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے ہیں اور مصطفےٰؐ بندے ہیں اس نے تمام دنیا میں سے محض ہم کو چھانٹا ہے اور تمام اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت ہمارے پاس ہے اور وہ بات جو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ تم اپنا عہد نباہو میں اپنا عہد نباہتا

بے شک تمھیں فضیلت دی ہے تمام عالم کے اوپر لیکن تم اپنے عہد کا حصہ نباہو،
پھر دیکھو کہ میں اپنے عہد کا حصہ کیسے نباہتا ہوں تو ان باتوں کا ذکر آیات کے طور
پر ہوا ہے، پھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس قوم میں جو ہدایت کرنے والے سمجھے جاتے تھے
جن کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا تھا تو ان کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ انھوں
نے اپنے آپ کو ایک علیحدہ کلاس (CLASS) بنا لیا اور وہ بھی اس بات کی کوشش
کرنے لگے کہ سوسائٹی کے اندر جیسے مختلف طبقات کا ایک مقام ہے تو ہم بھی کسی نہ کسی
طریقے سے اس اقتدار کے اندر اور اس مال کے اندر اپنا ایک مقام حاصل کریں گویا
ان کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ رہا بلکہ اس کے پردے میں انھوں نے
اپنے مفاد کے حصول کی کوشش کی چنانچہ ان کے لئے کہا گیا کہ یہ مال و دولت کے ڈھیر
جمع کرتے ہیں اور پھر عذابِ الٰہی سے ان کو ڈرایا گیا کہ یہی سونے اور چاندی کے ڈھیر
جو ہیں تو یہ گرم کر کے اس سے ان کے پہلو اور ان کی کمر اور ان کے سینے داغے جائیں گے
یہ حال ان لوگوں کا ہوا جو اپنے آپ کو ربی کہلواتے تھے اسی طرح
مسلمانوں میں بھی یہی بات ہوئی کہ کلامِ پاک کی تفسیر جو تھی تو وہ اپنے ظن سے اور
اپنی آرزوؤں سے کرنے لگے جس بات کو وہ سمجھتے اسی بات کو کلامِ پاک سے نکال لیتے
تھے، جس بات کو نہیں چاہتے تھے اسے چھپا دیتے تھے، گویا انھوں نے کلامِ پاک کا کوئی
حصہ تو دیکھا اور کوئی حصہ پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا اس وجہ سے کہ وہ ذرا تکلیف کا حکم تھا تو
اس کو چھوڑ دیا، اس کو کہتے ہیں معنی کی تحریف، تحریفِ الفاظ ہی کی نہیں ہوا کرتی
تحریف معنی کی بھی ہوا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کچھ منشا رہے تم اس سے دیدہ و دانستہ
ایسا مفہوم جو تمھاری آرزوؤں کے مطابق ہے تو وہ نکالنا شروع کر دو تو وہ ان لوگوں
کے متعلق تو یہ بات بتائی گئی کہ دیکھو تو یہ لوگ دنیا بھر کی
نیکیوں کی تلقین کرتے ہیں مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، اپنے گریبان میں منہ
ڈال کے نہیں دیکھتے، نیکی کی تلقین کرنے کا تو حق اسے پہنچتا ہے کہ جس کے اندر خود
نیکیاں موجود ہوں، ہر آدمی کو نیکی کی تبلیغ کا حق نہیں پہنچا کرتا، یہ امر بالمعروف کا

حق صرف ان کو حاصل ہے جس کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا ہے جس طرح ٹریفک کنٹرول کرنے والے سپاہی کے پاس سرکار کی چپراس ہوتی ہے۔ اگر سرکار کی چپراس اس کے پاس موجود ہے تو یقیناً آپ سڑک پر کھڑے ہوجائیں گے اور بڑے سے بڑے آدمی کو روکیں گے تو وہ رک جائے گا، اس کو جانے کی اجازت دیں گے تو چلا جائے گا لیکن اگر وہ چپراس موجود نہیں ہے تو پھر آپ کی بات بے اثر رہے گی۔ اسی طرح نیکی پہنچانے کا کام ہے۔ امر بالمعروف کا کام ہے جب تک وہ سلطان نہیں وہ اتھارٹی نہیں ہے جب تک آپ نے خود نیک بن کے وہ مقام حاصل نہیں کیا کہ آپ واقعی تذکیر کرسکیں، آپ واقعی امر بالمعروف کرسکیں تو آپ کی بات کے اندر تو کوئی وزن نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ آپکو سرکار سے چپراس نہیں ملی ہے، کوئی سند کوئی سلطان (AUTHORITY) آپکے پاس موجود نہیں ہے، تو ان کے لئے، ان یہودی علما کیلئے یہ بات بتائی گئی کہ یہ ساری دنیا کو تو نیکی کی تلقین کرتے ہیں۔ خدائے موسیٰؑ کے احکام اور شریعتِ موسوی کے قوانین پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں آپ کو مگر وہ ذرا اپنے آپ کو بھی تو دیکھیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو جب وہ اپنے آپ نہیں دیکھتے اور ان باتوں پر خود عمل نہیں کرتے جن کی وہ تلقین کرتے ہیں تو ظاہر ہے ان کی بات کے اندر اثر بھی نہیں پیدا ہوتا تو اس کی باتیں قومِ بنی اسرائیل کے متعلق بتائی گئی ہیں اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اوپر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی۔

ذلت اور مسکنت یہ دو باتیں ہوئیں، اب ذرا ان کے معنی کو بھی دیکھ لیں۔

ذلت کس کو کہتے ہیں تو وہ سیاسی بدحالی کا نام ہے کہ وہ خود اپنے مالک نہیں ہیں پیٹ بھرنے کے لئے رزق نہیں ہے، وہ دوسروں کی طرف دیکھتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سے ان کا ملک چلتا رہے۔ کسی نہ کسی طریقے سے ان کی قوم چلتی رہے کسی نہ کسی طرح سے ان کے جتنے بھی کاروبار ہیں تو وہ چلتے رہیں اور اگر وہ باہر کی امداد ہٹ جاتی ہے، وہ باہر کے قرضے جو ہیں تو وہ ہٹ جاتے ہیں، ان کا تمام اقتصادی نظام اور معاشرتی نظام ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے، .. .. .. تباہ ہوجاتا ہے اور مسکین اس کو

کہا کرتے ہیں کہ جو بغیر کسی کی مدد کے اپنے پاؤں پر خود کھڑا نہیں ہو سکتا تو مسکین بظاہر دیکھنے میں کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن اگر کمزوری اس درجے کے اوپر موجود ہے کہ بغیر دوسروں کی بخشش کے اور بغیر دوسروں کی خیرات کے کھڑا نہیں رہ سکتا تو اسی کیفیت کا نام مسکنت ہے تو ذلت سیاسی غلامی ہے اور مسکنت معاشی غلامی اور جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مستحق ٹھہرتی ہے تو اس پر ذلت و مسکنت تھوپ دی جاتی ہے۔

عزیزانِ گرامی! اپنی تقریر کی اس منزل کے اوپر ایک سوال مجھے کرنا ہے اور وہ یہ بات کرنی ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے واقعات، یہ تو سب کے سب آیاتِ الٰہی کا حصہ بنے اور آیاتِ الٰہی کا حصہ بننے کے بعد ان کی اہمیت صرف مکانی اور زمانی نہیں رہی، اب ان کا اطلاق کسی مخصوص وقت اور جگہ تک محدود نہیں رہا بلکہ کلامِ پاک کا حصہ بننے کے بعد یہ واقعات ابدی حقیقت بن گئے ہیں۔ یہاں تک، ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ کیا تاریخ بنی اسرائیل کے واقعات پر آ کر رک گئی۔ عزیزو! اپنے درود و سلام کے اندر ہم آلِ ابراہیمؑ کے ساتھ آلِ محمدؐ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آلِ محمدؐ کے اوپر بھی ایسی ہی برکت ایسا ہی درود و سلام ہو جیسا آلِ ابراہیمؑ کے اوپر ہے تو اب سوال یہ ہے کہ آلِ ابراہیمؑ کی تاریخ تو آیاتِ الٰہی بن گئی لیکن آلِ محمدؐ کی تاریخ جو ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے جزا و سزا کا قانون، کیا ایّام اللہ کی تاریخ قرآن کے نزول پر آ کر رک گئی اور اس کے بعد سے تاریخ بادشاہوں کی تاریخ ہو گئی۔ کیا مسلمانوں کی تاریخ جو ہے تو وہ بادشاہوں کی تاریخ ہے؟ اس مغالطہ کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں تاریخ کو سمجھنے اور قرآنِ پاک کے واقعات کا فہم حاصل کرنے کی جو کنجی دی گئی تھی اس کنجی کو ہم کلامِ پاک کے صفحات کے اندر کہیں رکھ کر بھول گئے اور کلامِ پاک کو پھر جزدان کے اندر بند کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام کے تمام قصے جو بیان کئے ہیں۔ یہ لھوالحدیث تو نہیں ہیں، یہ افسانے تو نہیں ہیں، یہ قصے تو نہیں ہیں، یہ آپ کے لئے نیند لانے کا ایک طریقہ تو نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کچھ حقیقتیں بیان کی جا رہی ہیں، اس کے اندر آپ کے لئے موعظت ہے۔

آپ کو یہ بتایا جارہا ہے کہ دیکھو یہ انقلاباتِ زمانہ جو ہیں، اور یہ دنوں کا بدلنا جو ہے اور یہ قوموں کا عروج و زوال، اچھی طریقے سے ان کو سمجھتے رہو۔ اس کے اندر امرِ الٰہی ہے، اس کے اندر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کام کر رہا ہے، تم کہیں دھوکے میں مت آجانا، طاقت کی نمائش کے دھوکے میں مت آجانا، دولت کی نمائش کے دھوکے میں مت آجانا۔ یہ کنجی ہے، اس کنجی کو لے کے تم تاریخ کو سمجھو لیکن ہم نے اس کنجی کو قرآن شریف کے کسی بیچ کے صفحوں کے اندر رکھ دیا اور رکھنے کے بعد قرآن شریف کو بھول گئے اور اس کے بعد سے جو ہماری تاریخ شروع ہوتی ہے تو وہ بادشاہوں کی تاریخ شروع ہوتی ہے، اور ایک بات آپ اور دیکھ لیں اور وہ یہ کہ ان تمام کے تمام واقعات میں ان تمام کے تمام اشاروں میں کسی جگہ بہت بڑے واقعات کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ کچھ بہت بڑی جنگیں ہوئی ہوں یا بہت بڑی شان و شوکت کی باتیں ہوئی ہوں تو وہ ذکر نہیں ہے۔ جناب سلیمانؑ و داؤدؑ کا تذکرہ ہے تو اس کے اندر بھی کوئی اس قسم کا ذکر نہیں ہے کہ انھوں نے جنگیں لڑیں یا ملک فتح کئے بلکہ باتیں جو ہیں تو وہ کچھ اس قسم کی ہیں کہ جناب سلیمانؑ گھوڑوں کا معائنہ کر رہے ہیں کہ اس دوران نماز کا وقت ہو گیا تو انھوں نے کہا کہ اوہو یہ دولت جو ہے، یہ گھوڑے جو ہیں تو یہ میرے دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، اور اس بات کا انھوں نے کفارہ ادا کیا۔ تو اس قسم کی باتیں ہیں کہ کچھ انصاف چاہنے والے آئے اور داؤدؑ نے زمین پر عدل قائم کرنے کی کوشش کی۔ حضرتِ داؤدؑ کا ذکر ہے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کی کہ تم اس طرح سے انصاف کرو۔ تو ایسی باتوں کا ذکر ہے۔ مگر یہ بات کہ ان کی بہت بڑی دولت تھی، بہت بڑی سلطنت تھی اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں انعام دیا تھا مگر کلامِ پاک میں جو اشارے ہیں وہ بظاہر چھوٹے ہیں، یہ چھوٹی باتیں نظر آتی ہیں کہ حطّہ کہنے کے لئے لوگوں سے کہا تھا انھوں نے حنطہ کہنا شروع کیا، من و سلویٰ اللہ تعالیٰ دیتا رہتا تھا انھوں نے یہ کہا کہ ہم تو مختلف قسم کے کھانے جو ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں تو اس قسم کی باتیں جو ہیں تو وہ اس کے اندر آئیں تو پتہ کیا چلا پتہ کہ اکثر ایسی باتیں جو عام طور سے بادشاہو

کی تاریخ میں چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھی جاتی ہیں اللہ کے نزدیک ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی چھوٹی باتوں کے اندر اپنی بڑی آیات دکھاتا ہے۔ کلامِ پاک کا معیار یہ ہے لیکن ہمارا بڑائی کا معیار ہی بدل گیا۔ ہم بڑے واقعات کو یہ سمجھتے ہیں کہ بھئی ایران کی فتح کا ذکر کرو، روم کی فتح کا ذکر کرو، مصر کی فتح کا ذکر کرو۔ اللہ تعالیٰ جن واقعات کا ذکر کرتا ہے اس میں کہیں ایسی باتوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر ہے تو اللہ تعالیٰ ہماری آنکھیں کھولتا ہے کہ اگر بات کا جو وزن کیا کرو کسی واقعہ کا جو وزن کیا کرو تو یہ مت دیکھو کہ اس کے اندر کتنا دھوم دھڑکا ہے۔ کتنی شان و شوکت ہے بلکہ اس کی معنویت کے اندر جایا کرو، محض چیزوں کے ظاہر کو مت دیکھا کرو بلکہ عاقبت کو دیکھا کرو اس کے اندر جو اس کی معنویت ہے اس کو دیکھا کرو۔

کلامِ پاک کے اس معیار کی روشنی میں اب یہ بات بالکل طے کر لیجئے کہ اسلام کی تاریخ بادشاہوں کی تاریخ رکھنی ہے یا اسلام کی تاریخ تلاشِ حق کی تاریخ رکھنی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں یہ بات دیکھنی ہے کہ کتنی جنگیں لڑی گئیں، کتنے ملک فتح ہوئے کتنی دولت جمع ہوئی، یا یہ بات دیکھنی ہے کہ اس قوم کا اللہ سے کیا تعلق رہا، کیسی دوستی کی ہے کیسی دشمنی کی، کیسی منافقت کی اور اس سے اس قوم کا سیرت و کردار کیسا بنتا چلا گیا اور اور کس طریقے سے اللہ کے عذاب آتے چلے گئے اور کس طریقے سے اللہ پھر کرم کرتا چلا گیا اور عذاب کے بعد کرم کرنا گویا ایک مہلت دینی تھی اور اس مہلت کا ہم نے کس طریقے سے فائدہ اٹھایا، یہ وہ معیار ہے جو ہمیں کلامِ پاک نے بتایا ہے اور اس نقطۂ نظر ( ) سے تم چلو گے تو یہ بات نظر آئے گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بعثت کے بعد اور حضورؐ کی تعلیم کے بعد پھر دوسرا بڑا واقعہ جو تمہیں نظر آئے گا تو وہ کربلا کا واقعہ ہے۔ امام حسین علیہ السّلام کی قربانی ہے، ویسے تم سیاسی تاریخ کے لحاظ سے دیکھو تو یزید بھی بہت بڑا بادشاہ تھا، یزید کی حکومت بہت بڑی تھی، اگر تم اٹلس کے اندر دیکھنا چاہو تو تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی کہ یزید کی حکومت کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اتنی بڑی حکومتوں کے اندر بغاوتیں ہوتی

رہتی ہیں، اور ان بنا توں کو کچلا بھی جاتا ہے۔ کربلا میں کل بہتر نفوس کی بات تھی، ان بہتر آدمیوں کو ایک بیابان کے اندر قتل کر دیا گیا۔ اس تمام واقعہ میں چند گھنٹے بھی نہیں لگے۔ بنی امیہ کی جو حکومت تھی تو وہ بھی موجود رہی۔ آلِ سفیان کے ہاتھ سے جو نکلی تو بنی مروان کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو اس واقعہ کو جب کربلا کا واقعہ لکھتے ہیں کہ سیاسی تاریخ کے اندر جو محض بادشاہوں کی تاریخ ہو بھلا کیا اہمیت ہے لیکن اگر تم اس نقطۂ نگاہ سے دیکھو جو قرآنی نقطۂ نگاہ ہے تو اس طرح سے تمھیں یہ بات، پتہ چلے گی کہ اس واقعہ نے تو لوگوں کے ضمیر بدل دیئے، اس واقعہ نے لوگوں کی نگاہیں بدل دیں، اس واقعہ نے جن زبانوں کے اوپر ظلم کے تالے پڑے ہوئے تھے تو وہ تالے کھول دیئے۔ اس واقعہ نے تو بصارت اور بصیرت دونوں کو بیدار کر دیا۔ یہ واقعہ تو ہمارے شعور کا، ہمارے تاریخی شعور کا، اور ہمارے ضمیر کا ایک حصہ بن گیا ہے، یہ تو ایک معیار بن گیا، بعد کی جتنی بھی قربانیاں ہیں ظلم کے خلاف ان کو دیکھنے کے لئے اور ان کو جانچنے کے لئے یہ ہمارے لئے سند بن گیا تو اس نقطۂ نگاہ سے تم دیکھو گے کہ جو کلام پاک کے اندر ہے تو تمھیں واقعہ کربلا کی یہ حیثیت نظر آئے گی تو تمھیں یہ بات نظر آجائے گی کہ واقعی بغیر واقعۂ کربلا کے تو ہماری تاریخ جو تھی تو وہ بھی نامکمل رہ جاتی اس لئے کہ اسلام کی تعلیم تو آگئی تھی لیکن یہ سبق کہیں نہیں آیا تھا کہ اگر اس تعلیم کو مسخ کیا جائے تو کیا طریق عمل اختیار کیا جائے، اسلام کی اقدار تو ہمارے سامنے تھیں لیکن ان قدروں کو مسخ کرنے سے بچانے کے لئے کس شان کے جہاد کی ضرورت ہے اور ان قدروں کے تحفظ کے لئے کس عزم و حوصلہ اور کس ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، یہ سبق ہمیں کربلا سے ملا۔ اور ایک بات میں آپ سے اور عرض کروں، یہ واقعۂ کربلا اور اس کا اثر تو ہماری تمام قوم کے اوپر ہے عام اس سے کہ کون کس فرقہ سے تعلق رکھتا ہو یہ ہر مسلمان شعور اور ضمیر کا ایک حصہ بن گیا، یہ ملتِ مسلمہ کی تاریخی شعور کا حصہ بن چکا ہے تو وہ لوگ جو اس ذکر مٹانا چاہیں تو ان کے متعلق ہمیں محض ایک بات عرض کرنی ہے اور یہ وہ بات ہے جو جناب زینبؑ نے یزید کے دربار میں کہی تھی کہ او یزید تو ہمیں ذلیل کرنا چاہتا ہے تو تو ہمیں اس وقت تک ذلیل نہیں کر سکتا جب تک

کہ تو ہمارے دین سے خارج نہ ہوجائے تو عزیزانِ گرامی! کربلا کا احترام، کربلا کی اہمیت کو سمجھنا یہ اسلام کے احترام کو سمجھنے کی سند ہے، کربلا کا احترام اگر دل میں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کا احترام دل میں ہے، کربلا کی اہمیت کو آپ سمجھتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اسلام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، آپ اسلام کا احترام کرتے ہیں، کربلا کی اہمیت کو کوئی مٹا نہیں سکتا جب تک کہ وہ دینِ اسلام سے خارج نہ ہوجائے ہاں اگر کوئی ایسا منحوس دن آئے کہ جب خدانخواستہ اس دنیا میں اسلام نہ رہے تو اس وقت کربلا کی اہمیت گھٹ سکتی ہے ورنہ کربلا کی اہمیت کسی کے گھٹانے سے نہیں گھٹ سکتی۔ اور یہ چند لوگ جو واقعۂ کربلا کو سیاسی اعتبار سے ایک چھوٹی سی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس عظیم روایت سے بے خبر ہیں جو اسلام کی تاریخ کی روشن ترین روایت ہے۔ عزیزانِ گرامی اس روایت کو تم دیکھو، یزید کی حکومت کو تو سب برا سمجھتے ہیں۔ یہ تو سب سمجھتے تھے کہ واقعی ظلم ہو رہا ہے لیکن حکومت اور سوسائٹی میں اپنی حیثیت (STATUS) سب کو عزیز تھی بڑے بڑے صحابیوں کی اولاد موجود تھی، لیکن صورت جو ہے تو وہ یہ کہ کوئی حدیث جمع کرنے میں لگا ہوا ہے، کوئی لوگوں کی بے چینی سے فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت کے قیام کا متمنی ہے۔ باوجودیکہ یزید کے مداحوں میں کوئی نہیں ہے یزید کو سب برا کہتے ہیں، یزید کو ظالم سب سمجھتے ہیں مگر یہ بات کہ اب بیعت ہوگئی، یزید کے ہاتھ پر تو ہمارا کیا بگڑتا ہے ہمارا تو وظیفہ آرہا ہے حکومت کی طرف سے اور یہ بھی ایک نیک کام ہے کہ ہم حدیثوں کو جمع کرتے رہیں گے، کتاب کو جمع کرتے رہیں، یہ بھی ایک تبلیغ کی بات ہے۔ عزیز و ظلم جو ہے تو وہ ہو رہا ہے، لوگوں کے اوپر ظلم و جور سے حکومت کی جارہی ہے اور تمام کے تمام وہ لوگ کہ جن کی طرف لوگوں کی نگاہیں اٹھ سکتی تھیں تو وہ سب کے سب خاموش بیٹھے ہیں یہ تو علیؑ کا لال تھا جو اس ظلم کو برداشت نہ کرسکا اور اس ظلم کو مٹانے کے لئے اٹھا۔

اور تم یہ تو دیکھو کہ امام حسینؑ نے اس واقعہ کی کیسی تیاری کی۔ اس واقعہ کا اہتمام کیا ہوا، یہ جو بظاہر چند گھنٹوں کا واقعہ ہوا ہے تو اس کا اہتمام کیا وسیع ہے، میں پیچھے

کی تاریخ کی طرف نہیں جاتا، میں اس جگہ پر امام حسن علیہ السّلام کی صلح تک ہی جاتا ہوں، یہ تو تم کہہ لیتے ہو کہ صلحِ حدیبیہ اور صلحِ حسنؑ میں ایک طرح کی مشابہت ANALOGY ہے۔ عزیزو! مشابہت اگر دیکھنی ہے تو ایک اور نظر سے دیکھو، وہ یہ دیکھو کہ صلحِ حدیبیہ نے فتحِ مکہ کا راستہ ہموار کیا تھا، اگر صلحِ حدیبیہ نہ ہوتی اور آپس میں لڑائیاں شروع ہوتیں تو کوئی جوازِ فتحِ مکہ کا نہیں ہو سکتا تھا وہ تو جس وقت کہ ایک معاہدہ ہوا اور اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی تو فتحِ مکہ کا راستہ کھل گیا تو اسی طرح سے یہ جو صلحِ حسنؑ ہے اور یہ جو معاہدہ ہوا تو ظلم کے اوپر اور بھی حجّت تمام ہو رہی ہے اس لئے کہ اس صلحِ حسنؑ سے واقعہ کربلا تک وہ یزید ہوں یا یزید کے والد بزرگوار وہ اور زیادہ جو کچھ بھی ظلم ہو سکتے ہیں تو وہ ڈھاتے چلے جا رہے ہیں تو حجّتیں جو ہیں تو وہ اور پوری ہوتی چلی آ رہی ہیں، مومنین خالص ہوتے چلے جا رہے ہیں اس ظلم کی آگ کی بھٹی میں سے دہک کے سونا اور نکھرتا جا رہا ہے۔ یہ اہتمام اس واقعہ کے لئے ہوا اس اہتمام کے بعد اب یہ بہتر ساتھی جو ہیں تو وہ رہ گئے ہیں، ان بہتر ساتھیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ایک پر امام حسین علیہ السلام کی نگاہ ہے، کسی کو بلایا جا رہا ہے، بہت سوں کو رخصت کیا جا رہا ہے، اور میں آپ کو ایک اہتمام بتاؤں۔ اہتمام یہ بھی ہوا کہ جہاد کرنے کے لئے جایا جاتا ہے تو لشکر ساتھ لے کر نہیں جاتے ہیں بلکہ اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر جا رہے ہیں، عورتوں کو ساتھ لے کر جایا جا رہا ہے اور بچّوں کو ساتھ لے کر جایا جا رہا ہے۔ ہاں عزیزو ہمارے لئے بہت بڑا اور اہم مقام ہے بیت اور اہلبیت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ہمارا رسولؐ جس وقت کہ مباہلہ کے اندر جاتا ہے تو وہ بھی گھر والوں کو لے جاتا ہے۔ ہمارا امامؑ جس وقت کہ کربلا کے اندر جاتا ہے تو بھی گھر والوں کو لے کر جاتا ہے۔ رسولؐ مباہلے میں اپنی بیٹی اور بچّوں کو لے کر گئے تھے کہ میری دعا پر آمین کہنا۔ تو عزیزو کربلا میں جو واقعہ ہوا تو یہ عورتیں اور یہ بچّے یہ اس لئے جا رہے ہیں کہ اس دعا پر آمین کہیں، اس بات کو اور بڑھاؤ۔ اور جس وقت کہ شہادتِ حسینؑ ہو چکی تو اس کے بعد کے واقعات سے معلوم ہوا کہ امام حسینؑ اپنے ساتھ بچّوں اور عورتوں کو کیوں لے کر گئے تھے۔

۞

چھٹی مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمام حمد اللہ کے لئے جو رب العالمین ہے، جو رحمٰن ہے، جس کی رحمتیں سب پر عام ہیں، عام اس سے کہ کوئی شکر گذار بندہ ہو یا انکار کرے، جو رحیم ہے جس نے ہماری ہدایت کا سامان کیا بے شک سب ہدایت اسی کی طرف سے ہے۔ اس ہدایت کے علاوہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور جو اس کی طرف بڑھتا ہے، اس کی طرف بڑھتا ہے جو اس کو یاد کرتا ہے اور جو سزا و جزا کے دن کا مالک ہے۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم اسی کے عبد ہیں۔ اسی سے استعانت کرتے ہیں اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی ذات نہیں جو بندے کی مدد کر سکے اور اس سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری ہدایت کرے، سیدھے راستے کے اوپر صراطِ مستقیم کے اوپر، جو ان لوگوں کا راستہ ہے جن کے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعامات نازل ہوئے نہ ان لوگوں کا جن کے اوپر اللہ کا غضب نازل ہوا اور جو راستے سے گمراہ ہوئے اور میں درود بھیجتا ہوں اس اللہ کے رسولؐ پر جس پر قرآن نازل کیا گیا، وہ قرآن کہ جو اگر پہاڑ کے اوپر نازل کیا جاتا تو وہ بھی اللہ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ ہمارا اسلام ہو اس قلب پر جس نے اس قرآن کو قبول کیا۔ وہ قرآن جس کے اندر موعظۃ ہے، جس کے اندر موعظت ہے، جس کے اندر نصیحت ہے، جس کے اندر اطاعت کرنے والے بندوں کو خوش خبریاں ہیں، جس کے اندر نافرمانی کے لئے زجر ہے ڈراتا ہے، وہ قرآن کہ جس کے اندر جو ہمارے سینوں کے اندر بیماریاں ہوتی ہیں اس کیلئے شفا ہے جس کے اندر ہدایت ہے اور رحمت ہے ایمان لانے والوں پر، وہ رسولؐ کہ جو ہمارے اوپر رؤف و رحیم ہے جس نے صراطِ مستقیم کی تمیز کی اس کو ظاہر کیا، خود اس پر چل کر دکھایا تاکہ صراطِ مستقیم کی اس تعریف کے بعد اور اس حجت آنے کے بعد اور اس آیت کے بعد پھر گمراہی کے لئے کوئی معذرت اور حجت

باقی نہ رہے۔

اور میرا اسلام ہو ائمۂ ہدیٰ پر جو صراطِ مستقیم کے نشان ہیں، جو اس صراطِ مستقیم کے رہبر ہیں، جو خود صراطِ مستقیم ہیں وہ ائمۂ ہدیٰ جو لوگوں کی ہدایت کرتے رہے، ہر حال میں جتنے مفاسد عمل میں اور خیال میں ہو سکتے ہیں وہ ان کو پیش آئے اور ان کے سامنے رونما ہوئے، بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں، سلطنتوں کو زوال ہوا، انقلابات آئے، دوسری سلطنتیں قائم ہوئیں، جتنے مکاتیب خیال ہیں، جتنے مختلف مذاہب ہیں وہ سب کے سب ان کے سامنے رونما ہوئے اور جس وقت کہ ہر قسم کے مفاسد رونما ہوئے سیاست کے اندر اور معاشرے کے اندر اور لوگوں کے قلوب کے اندر، اذہان کے اندر تو ان تمام حالات میں اور ان تمام مواقع پر انھوں نے ہماری ہدایت کی اور ہمارا اسلام ہو اس امام پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت اور اپنی مشیت سے پردۂ غیبت میں بلایا تاکہ ہمارا یہ امتحان ہو کہ ہم اس غیبت کے زمانے میں غفلت کے اندر سو رہے ہیں، اس طرح سے زندہ ہیں کہ ہمارا کوئی امام ہی نہیں ہے۔ زبان سے کبھی کبھی کہہ دیتے ہیں کہ ہم آپ کے ظہور کی دعا مانگتے ہیں یا ہم اس طرح زندہ رہ رہے ہیں کہ جیسے ہمارا امام ہمیں دیکھ رہا ہے اور یہ دیکھ رہا ہے کہ ہم کیا تیاریاں کرتے ہیں، کس طریقے سے اس مہمان کا استقبال کرنے کے لئے تیاریاں کرتے ہیں، کہیں اس ہدایت کو ہم نے اٹھا کے طاق پر تو نہیں رکھ دیا بھلا تو نہیں دیا، کہیں ہم اس گلے کی طرح تو نہیں ہیں کہ جس میں اور اس کے نگہبان کے اندر بہت فاصلہ ہو چکا ہو اور جو اپنے نگہبان کو بھول گیا ہو ہادی کے ظہور کے بعد جو انکے تابعدار ہوتے ہیں وہ بھی موجود ہو جاتے ہیں جو سچے ہوتے ہیں وہ بھی معلوم ہو جاتے ہیں جن کے زبانی دعوے ہوتے ہیں وہ بھی معلوم ہو جاتے ہیں جو مخالفت کرنے والے ہیں اور باطل کے اوپر اڑنے والے ہیں وہ بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ ہر آدمی کی اپنی جگہ مقرر ہو جاتی ہے۔ ایک بات تاریخ کے اندر ذرا بڑی عبرتناک ہے اور ڈرانے والی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہود بھی کسی مسیح کا انتظار کر رہے تھے اور وہ بھی ہماری طرح سے دعائیں مانگتے تھے، مسیح کے

کے آنے کی، کوئی سنجات دہندہ، کوئی مسیح آئے اس لئے کہ اس کے بارے میں عہد کیا گیا تھا اور جس وقت وہ مسیح آیا تو اس وقت وہی لوگ کہ جو علم کے خزانوں کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے، سب سے پہلے انھوں نے انکار کیا اور کچھ ٹوٹے پھوٹے آدمی کچھ دستکار، کچھ مچھلیاں پکڑنے والے اس قسم کے آدمی جو تھے مسیح کے گرد جمع ہو گئے، اور اسی طرح سے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت سب سے پہلے ان اہلِ کتاب نے انکار کیا کہ جن کی کتابوں کے اندر رسولؐ کے آنے کی بشارت دی گئی تھی اور حضورؐ کے آنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور حضورؐ کے چاروں طرف جو لوگ آئے وہ زیادہ تر لوگ تھے کہ جن کو سفیہ کہا جاتا تھا جن کو لوگ چھوٹے یا نیچ کہتے تھے تو اس قسم کے آدمی تھے تو حضورؐ کے چاروں طرف تھے تو اس طرح سے جس وقت کہ ہم دعا مانگتے ہیں اپنے امام کے ظہور کی تو یہ بھی ہمیں سوچ لینا چاہیئے کہ ہم نے اندر کوئی نشانی پیدا کی اپنے اندر جس سے کہ امامؑ ہمیں پہچان سکے، ہم نے اپنے آپ کو کچھ تیار کیا کہ جس وقت وہ کہے کہ اللہ کی طرف میرے انصار کون ہیں تو اس وقت ہم اس آواز کے اوپر لبیک کہہ سکیں۔ اس لئے کہ رسولؐ یا امامؑ کے انصار ہونے کے لئے بڑی نظر کی ضرورت ہے۔ بڑی ہمت کی ضرورت ہے، بڑے ایمان کی ضرورت ہے تو کہیں ایسا نہیں ہے کہ ہم زبان سے اس کے بلانے کے لئے دعائیں مانگتے ہوں اور ہم دل میں یہ کہتے ہوں کہ کسی طرح سے ہماری زندگی تک ان کا ظہور نہ ہو اس لئے کہ اگر اس کا ظہور ہو گیا تو خدا جانے ہم کون سی کیٹگری (CATEGORY) کے اندر ہوں گے۔ خدا جانے اس کے ساتھیوں میں سے ہوں گے خدا جانے منافقوں میں سے ہوں گے اس لئے کہ شیطان کے بہکانے کا کچھ پتہ نہیں تو اس طرح سے عزیزو! ہمیں اس بات کے لئے اپنی تیاری کرنی ہے کہ ہم اس مہمان کا استقبال کر سکیں۔ یہ تو ایک ضمنی بات آ گئی چونکہ امامؑ آخر الزماں کی طرف اشارہ ہو گیا تھا۔

کل میں اپنی تقریر کے اندر جو بات کہہ رہا تھا وہ مختصراً ایک جملے میں یہ ہے کہ ہمیں وہ قلب اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے اور وہ نظر پیدا کرنا چاہیئے کہ جس کے اندر وہ واقعات و حوادث جو زمانے میں رونما ہوتے ہیں ان میں ہم اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دیکھ سکیں، اور

اسلام کی جب ہم تاریخ دیکھتے ہیں تو ہمارے اندر یہ معیار ہونا چاہیئے کہ اسلام کی قدریں کیسے قائم ہوئیں اور کس نے ان کو مضبوط کیا، کس نے لوگوں کے قلوب اور اذہان کو بدل دیا یہ دیکھنا کہ کس نے کتنے آدمیوں کے سر جھکا لیئے اور کتنے بڑے لشکر جمع کر لیئے اور کتنے ملک فتح کر لیئے، لیکن قرآن جن اصولوں کا ہمیں فہم دیتا ہے وہ تاریخ کی روش سے شکر ہیں، اور کامیابی کا اور ناکامی کا معیار جو قرآن سے ہم اخذ کر سکتے ہیں اسی معیار کو ہمیں اپنے سامنے رکھنا ہے اس لیئے کہ رسولؐ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرنے کے لیئے آیا ہے سلطنت قائم کرنے کے لیئے اور ملک فتح کرنے کے لیئے نہیں آیا ہے تو دین کس جگہ غالب ہوتا ہے، کس طرح غالب ہوتا ہے؟ دین کے اوپر جس وقت حملے ہوتے ہیں جس وقت مخالفتیں ہوتی ہیں تو کس طرح اس کی محافظت کی جاتی ہے تو اس بات کو ہمیں اپنی تاریخ کے اندر اگر ہم بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس بات کو دیکھنا چاہیئے اور اس معیار کی روشنی میں میں نے آپ کے سامنے عرض کیا تھا کہ جناب امیرالمومنینؑ کی زندگی کس قدر کامیاب تھی۔ امام حسین علیہ السلام کی زندگی کس قدر کامیاب تھی اور کامیابی کا یہی ایک معیار اپنے سامنے رکھنا ہے۔ بار بار اس بات کو دہرانے کی اس لیئے ضرورت پڑتی ہے کہ اس حقیقت کو اکثر بھلایا جاتا ہے اس لیئے کہ سلطنتوں کے جاہ وحشم شان و شوکت ایسے ہوتے ہیں کہ خوامخواہ لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ خوامخواہ لوگوں کے قلوب کے اوپر ان کا رعب چھا جاتا ہے لیکن تاریخ کو ہمیشہ، اسلام کی تاریخ کو ہمیشہ اسلام کے تابع ہونا چاہیئے اسی روشنی کے اندر اسلام کی تاریخ کو دیکھنا چاہیئے، اسلام سے علیحدہ کر کے اسلام کی تاریخ سمجھ میں نہیں آتی ہے اور اسی وجہ سے اس تاریخ کو سمجھنے کے لیئے ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ آخر یہ دین تھا کیا؟ یہ اسلام کا پیغام جو لوگوں تک پہنچا تو وہ تھا کیا؟ اور اس معیار کو جب ہم اپنے سامنے رکھتے ہیں تو ایک لفظ ایک فقرے میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جو روایت امام حسین علیہ السّلام نے کربلا کے اندر قائم کی مظالم کو رد کرنے کی اور ظالموں کی مخالفت کرنے کی تو یہی ایک روشن خط ہے۔ تمام کی تمام مسلمانوں کی تاریخ کے اندر اگر اس خط کو تم نکال دو تو پھر

اسلام کی داستان سوائے ایک شاہنامے کے اور کچھ نہیں رہ جائے گی یہی زندگی کی جو روایت قائم کی گئی ہے اسی کا یہ فیض اور اسی کی یہ برکت ہے کہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایمان رکھنے والا، کوئی نہ کوئی نگاہ رکھنے والے نے کھڑے ہو کر سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق بیان کیا، کلمۂ حق کا اعلان کیا تو محض یہی ایک روشن نقطہ ہے ہماری تاریخ کے اندر ایک روشن خط یہی ہے۔ یعنی مظالم کو رد کرنے، ظالموں کی مخالفت کرنے اور کلمۂ حق کو بلند کرنے کی روایت جو امام حسینؑ کا فیض ہے اور جناب امام حسین علیہ السلام کے متعلق جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ سلطنتوں کے عروج وزوال میں دیکھنے کی بات یہی ہوتی ہے اس لئے کہ اکثر قومیں اپنے اندر اور اپنی طاقت کے اندر ڈوب کے ختم ہو گئیں، فنا ہو گئیں، کیونکہ اس قوم کے اندر کوئی حرفِ حق کہنے والا نہیں تھا، جس وقت کسی قوم میں کلمہ حق کہنے والا کوئی نہ ہے تو وہ قوم اپنی دولت اور طاقت کے باوجود فنا ہو جاتی ہے ظلم کے خلاف احتجاج محض ایک فرد کا احتجاج نہیں ہوتا بلکہ وہ پوری قوم کی زندگی کی ضمانت ہوتا ہے۔ تو اس طریقے سے یہ روایت اسلام میں قائم ہوئی اور یہ روایت اسلام میں ہر دور اور نظام کے اندر چلی۔

یہ جو بات کہی جاتی ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا نتیجہ کیا ہوا؟ تو اس کے لئے بس دو باتیں مجھے کہنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بڑا عمل خود اپنا جواز ہوتا ہے۔ نتیجہ جو ہے وہ دینے والا اللہ تعالیٰ ہے لیکن اپنی جگہ یہ کیا کم بات ہے کہ رسولؐ کے نواسے نے ظلم کا مقابلہ کیا اور اس جگہ لا الٰہ الا اللہ کو ثبت کیا کہ جس جگہ بادشاہ پرستی چل پڑی تھی تو عزیزو ایک بڑا عمل خود اپنا خود اپنا جواز ہوتا ہے، خود اپنا شاہکار ہوتا ہے کہ جس کے اندر انسان اپنی خودی کو چھوڑ کے خدا کی طرف چل پڑتا ہے، بڑے عمل کی تعریف یہ ہوتی ہے کہ جس وقت کہ اپنی خودی رہتی ہے، اپنے حوصلے رہتے ہیں، اپنی امنگیں رہتی ہیں، اپنی آرزوئیں رہتی ہیں، اپنے مقاصد رہتے ہیں، اس وقت تک بڑا عمل نہیں ہوتا جس وقت کہ ان سب کو چھوڑ

کے بندہ اللہ کی رضا کے حصول کی جد و جہد کرتا ہے تو اس وقت وہ بڑا عمل ہوتا ہے، تو ایک بڑا عمل ہونا یہ خود ایک بہت بڑی بات ہے، بڑے عمل کی ایک اور تعریف میں آپ کے سامنے بیان کروں گا، یہی میں کل عرض کر رہا تھا کہ کربلا کے واقعہ کو سیاسی اعتبار سے مت دیکھو سلطنت یوں کی یونہی قائم رہی آلِ سفیان کے بعد آلِ مروان آ گئے، حکومت کے ظلم و جور میں بھی کمی نہیں آئی بلکہ وہ ظلم اور بڑھے مگر عزیزو! ایک بڑے عمل کی یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ انسانی ممکنات کا دائرہ وسیع کر دیتا ہے۔ ایک بڑا عمل وہ ہوتا ہے کہ جس وقت تک وہ ہو نہیں جاتا اس وقت تک کسی کو یقین نہیں آتا کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے لیکن وہ عمل جب ظاہر ہوتا ہے تو انسانی ممکنات کی نئی سرحدیں اور عمل کی عظمت کے لئے افق سامنے آتے ہیں اور پھر اس عمل سے جو اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ انسانوں کے لئے فکر و عمل کی نئی راہیں کھول دیتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں کربلا کے اثرات، اور شہادتِ حسینؑ سے مرتب ہونے والے نتائج اور اس سے ابھرنے والے ردِ عمل کو آپ دیکھیں، میں اس بات کی طرف نہیں جا رہا ہوں کہ کس کس نے اس خونِ ناحق کا انتقام لینے کی مہم چلائی۔ مختار نے کس طرح انتقام لیا اور کیسا ان ظالموں کا خون بہایا، میں تو یہ بات کہتا ہوں کہ ان ظالموں کا خون اگر اس سے دس ہزار گنا بھی بہ جاتا تو بھی ان کا خون حسینؑ کے ایک قطرۂ خون کے برابر نہیں ہو سکتا اور پھر جو بھی راہِ خدا میں شہید ہو اس کا ہم کیا بدلہ لے سکتے ہیں۔ اس کا انعام دینے والا اللہ تعالیٰ ہے تو ایک تو کربلا کا یہ ردِ عمل ہوا اور دوسری بات، یہ ہوئی کہ اس واقعۂ کربلا سے اسلام کی تاریخ کے اندر، ملت کی تاریخ کے اندر ایک وہ روایت قائم ہو گئی کہ جس سے ملت کی جان باقی ہے، ملت کے اندر ایک روح باقی ہے، اگر اس روایت کو نکال دو تو پھر مسلمانوں کی تاریخ ایک افسانہ اور ایک داستان ہے، وہ سنتے چلے جاؤ کہ اس بادشاہ نے اس کو مارا اور اس بادشاہ کا یوں جاہ و جلال تھا، اور اس بادشاہ کے سامنے اتنے آدمی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، اگر کربلا کو نظر انداز کر دو اور اس روایت، کو جو کربلا کے نتیجہ میں

قائم ہوئی تو پھر اسلام کی تاریخ بھی محض شاہنامہ ہے۔ یہ رسولؐ کے نواسے کا کرم ملت کے اوپر اور ملت کی تاریخ کے اوپر ہے کہ مسلمانوں میں ظلم کے خلاف جہاد کرنے اور حق کو قائم کرنے کی ایک روایت زندہ رہی اور یہ بات ہر نظام اور ہر دور میں ہوتی چلی گئی، کتنے نظام بدلے، ایک قبائلی نظام تھا اس کے بعد ایک مرکزیت پیدا ہوئی اس کے بعد بادشاہت آگئی، اس کے بعد جمہوریت شروع ہوگئی۔ پیداواری طریقہ سے دیکھو تو لوگ تجارت کرتے تھے اور بیابانوں کے اندر گلہ بانی کرتے تھے۔ پھر اس کے بعد جاگیرداری اور زمینداری کا نظام پیدا ہوا، پھر دنیا سوشلزم کی طرف بھی جارہی ہے تو کتنے دور بدلتے چلے گئے، کتنے نظام بدلتے چلے گئے، لیکن یہ بات جو تھی کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی ایک روایت تو یہ بات ہر دور کے اندر تھیں کم و بیش نظر آتی چلی جائے گی اور ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس روایت کو قائم رکھیں اس لئے کہ عزیزو کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کے غضب کے اور کسی قوم کے درمیان محض ایک حرفِ حق کہنے والا ہوتا ہے، وہ حرفِ حق کہنے والا جو ہوتا ہے تو وہ تمام کی تمام قوم کی نجات کا باعث بن جاتا ہے اور میں تو اکثر یہ بات سوچتا ہوں کہ حسینؑ کی آواز کے اوپر اگر حرؓ نہ آگئے ہوتے، اگر حرؓ جو اس وقت تمام انسانیت کی نمائندگی کر رہے تھے اس آواز پر لبیک نہ کہتے تو کیا اس بات کا جواز باقی تھا کہ انسانیت باقی رہے اور حریت قائم رہے، اگر خدا کا کوئی رسولؐ یا امامؑ دعوتِ حق دے اور اس آواز پر لبیک کہنے والا اس کی تائید و تصدیق کرنے والا کوئی نہ ہو تو پھر اس قوم کو تباہ کر دیا جاتا ہے پھر اس کو ختم کر دیا جاتا ہے، کوئی نہ کوئی تصدیق کرنے والا، کوئی نہ کوئی آواز اٹھانے والا کوئی نہ کوئی رسولؐ کی تصدیق کرنے والا اسلئے کہ رسولؐ کی آواز اللہ کی آواز ہے تو کوئی نہ کوئی انسانیت کی طرف سے انسانیت کی نمائندگی کرنے والا، لبیک کہنے والا ضرور ہوگا، وہ ضرور ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں بشارت دی دی ہے وہ یہ کہ ایسے لوگ ہر دور کے اندر کچھ نہ کچھ موجود ضرور رہیں گے عام طور سے ایک بات کہی جارہی ہے مجھے معلوم نہیں ہے کہ اس کی کیا سند ہے اور کیا سند نہیں ہے۔

لیکن کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ میری امت کبھی باطل کے اوپر مجتمع نہیں ہوگی۔ اب لوگ جو تھے وہ اس کا مطلب سمجھنے لگے کہ جو بات کثرتِ رائے سے کی جاتی ہے وہ ٹھیک ہوگئی، جس پر اجماع ہوگیا تو وہ بات ٹھیک ہوگئی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بات اس کے برعکس ہے، دراصل حضورؐ یہ بشارت دے رہے ہیں کہ میری قوم اتنی گئی گذری نہیں ہوگی کہ اس امت میں باطل کے خلاف کوئی حق کی آواز اٹھانے والا نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی حق کی آواز اٹھانے والا ضرور ہوگا اور اگر کثرت باطل کی طرف ہو بھی جائے تب بھی کوئی نہ کوئی اس کے خلاف آواز بلند کرکے امت کو باطل پر مجتمع نہ ہونے دے گا۔

عزیزانِ گرامی! دور بدلتے گئے یہ نظام بدلتے گئے مگر جو زندہ روایتیں ہیں وہ باقی رہتی ہیں، کبھی ان میں تیزی آجاتی ہے، کبھی کمی آجاتی ہے تو روایت بہرحال باقی رہتی ہے اس لحاظ سے میں آپ سے یہ بات کہتا ہوں کہ اسلام کسی نظام کا نام نہیں ہے، نظام تو ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ جو چیز قائم رہتی ہے وہ اقدار ہیں، وہ ہر نظام کی ہیئت کو بدل دیتی ہیں تو دینِ اسلام کسی نظام کا نام نہیں ہے، ایک بات میں آپ سے عرض کردوں بڑی سامنے کی بات ہے اور وہ یہ کہ دینِ اسلام کے جو نظام قائم کئے جاتے ہیں وہ سب آپنے دیکھ لئے یعنی سیاسی نظام بھی دیکھ لیا، اقتصادی نظام بھی دیکھ لیا لیکن دین کی سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مانو تو یہ عقیدہ کونسے نظام کا حصہ ہے۔ سب سے مرکزی بات جو ہے وہ یہ ہے کہ نماز پڑھو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکاؤ، تو یہ کون سے نظام کا حصہ ہے۔ خواہ وہ اقتصادی نظام ہو یا سیاسی، نظام الصلوٰۃ کس نظام کا حصہ ہوگا۔ حالانکہ یہ بات، جو ہے یعنی نماز کا ہونا صلوٰۃ کا ہونا یہ تو دین کی جان ہے، اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتا تو اس کے تو اسلام کے قبول کرنے میں شک ہونے لگتا ہے تو اب صورت اس کی یہ ہے کہ آپ گردنیں تو جھکوا سکتے ہیں لیکن قلب نہیں جھکوا سکتے۔ قلب کا جھکنا تو ایمان کی بات، ہوتی ہے، مگر کسی نظام میں ایسا کوئی نسخہ تو نہیں ہے جو لوگوں کے قلب کے اندر ایمان پیدا کردے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ایسا ہی نسخہ لے کر آئے تھے وہ تو دل کے اندر بیج بودیا کرتے تھے، وہ تو ایمان ... ا

کر دیا کرتے تھے، تو وہ نسخۂ کیمیا کبھی کسی کے پاس ہے یا نہیں یا محض یہ تمام کے تمام نظام ہی نظام موجود ہیں، نظام جو ہے تو وہ ایک (FRAMEWORK) یعنی ڈھانچہ ہے، اس کے اندر کچھ ادارے ہوتے ہیں۔ اب ایک بات میں آپ سے عرض کروں، یزید کی جو مخالفت کی امام حسین علیہ السلام نے تو اس کی بنیاد کیا تھی؟ کیا امام حسین علیہ السلام نے یہ کہا کہ یزید کی حکومت شخصی حکومت ہے، شخصی حکومت نہیں ہونی چاہیئے بلکہ جمہوریت ہونی چاہیئے، کیا کبھی اشارتاً بھی ایسی کوئی بات آپ نے فرمائی۔ نہیں بلکہ امام نے تو یہ بات کہی کہ دیکھو میری جان کی قسم امام وہ ہوتا ہے جو کتاب اللہ کو سامنے رکھ کر حکومت کرتا ہے، امام وہ ہوتا ہے جو قسط اور عدل کو قائم رکھتا ہے، امام وہ ہوتا ہے جو دین سے آراستہ ہوتا ہے، انھوں نے تو یہ بات کہی کہ امام وہ ہوتا ہے کہ جس کا عمل اور ترکِ عمل سب رضائے الٰہی کے تحت ہوتا ہے ان باتوں میں کہیں کسی نظام کی بات نہیں ہے۔ امام حسینؑ نے یہ کبھی نہیں کہا کہ شخصی حکومت ہونی چاہیئے یا جمہوریت، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تم دیکھو، ان کے زمانے میں معاشرتی نظام جو تھا وہ قبائلی نظام تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قبیلوں کو ختم تو نہیں کیا (جنگ میں بھی جس وقت جاتے تھے تو قبیلوں کا لحاظ برقرار رہتا ہے) ہاں اتنی بات ضرور کی، اور وہ بڑی زبردست بات تھی کہ اس قبیلے میں ہونے کی جگہ بتائی، یہ بتایا کہ کسی قبیلے سے تمھارا تعلق اس لئے ہے کہ تمھارا تشخص ہو سکے تاکہ تم پہچانے جاؤ ورنہ حقیقت انسان کے شرف اور کرامت کا پیمانہ اس کا تقویٰ ہے نہ کہ قبیلہ، تو آپؐ نے قبائلی نظام کو ختم نہیں کیا بلکہ اس کی حیثیت کو معین کر دیا اور آگے چل کر اس بات کو سمجھیں کہ کلامِ پاک کے اندر غلاموں کا بھی ذکر ہے اس (ادارے) کو جو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ضروری تھا اور جس کو ختم کر دینا خود غلاموں کے اوپر ظلم ہوتا تو اس ادارے کو ختم نہیں کیا، ہاں اس کے متعلق یک حقیقت بیان کر دی اور وہ حقیقت وہ ہے جس کی آج بھی بہت بڑی سخت ضرورت ہے اور جس کی شاید اس زمانے سے زیادہ اور کبھی ضرورت نہ تھی اور وہ یہ بات کہی کہ دیکھو جسے تم غلام کہتے ہو وہ بھی

انسان ہیں، غلام کو انسان سے نیچا نہ سمجھا اور آج بھی میں یہ بات کہتا ہوں کہ کتنے وہ آدمی ہیں کہ جو ان کے زیر دست کام کر رہے ہیں، ان کو وہ انسان سمجھتے ہوں یا کہ جو ان سے اونچے بیٹھے ہوئے ہوں ان کو انسان سے بالا نہ سمجھتے ہوں، کتنے آدمی کتنے جواد و کریم الطبع لوگ ہیں جو انسان کو انسان سمجھتے ہوں، انسان کو انسان سمجھنا جو ہے تو وہ بہت مشکل ہے اور خدا کو خدا سمجھنا اور خدا کی قدر کرنا تو اس سے بھی مشکل ہے۔

گویا کسی نہ کسی قسم کا کوئی ڈھانچہ ہم نے کھڑا کر دیا اور اس بات کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ اسلامی نظام ہے تو مجھے بڑا ڈر ہے کہ اس کے اندر سے کہیں دین کی روح بالکل ختم نہ ہو جائے، کہیں کوئی ایسا ڈھانچہ کھڑا نہ ہو جائے کہ جس کے اندر دین کی روح بالکل نہ ہو، محض ظاہری ڈھانچہ، محض بے روح جسم موجود ہے۔ اگر کہیں ایسا ہو گیا تو پھر ایک بات میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ شاید دین کے نام پر جتنے ظلم کیے گئے ہیں وہ اور کسی چیز کے نام پر نہیں کیے گئے، وطن کی دوستی کے نام پر یا سلطنتوں کی توسیع کے نام پر یا کسی ازم کے نام پر اتنے ظلم نہیں کیے گئے جتنے دین کے نام پر ظلم کیے گئے ہیں اس لئے کہ دین کے نام کے اوپر جو ظلم کیے جاتے ہیں ان کا ایک اخلاقی اور دینی جواز حاصل کر لیا جاتا ہے اور جس وقت کہ وہ جواز حاصل ہو گیا تو اس کے بعد تو ظلم کو ڈھانا کارِ ثواب بن گیا، دینِ اسلام کے بتانے ہوئے زندگی کے اصول اور زندگی کی قدروں کی حیثیت ایسی ہے کہ کوئی سا دور ہو، کوئی سا نظام ہو اس کے اندر وہ قدریں نہیں بدلتیں بلکہ اس نظام کو بدل دیتی ہیں، جیسے کیمیا کے اندر ایک عمل انگیز (CATALYST) ہوتا ہے جو خود نہیں بدلتا دوسرے مرکبات کو بدل دیتا ہے۔ تو اسی طریقے سے دین ہے جو خود نہیں بدلتا وہ ہر نظام کو بدل دیتا ہے تو اگر دین کو ہم نے کسی نظام سے مربوط کر کے اسے اسلامی نظام بنانے کی کوشش کی۔ اگر ہم اس طرح کے فیصلے کرتے رہے کہ اسلام کے اندر جمہوریت ہے اور اسلام کے اندر آمریت ہے اور اسلام کے اندر سرمایہ داری ہے اور اسلام کے اندر سوشلزم نہیں ہے آپ کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں آپ جو جی چاہے کریں تو اس وجہ سے میں خاص طور کے

اوپر اس بات کو عرض کرتا ہوں کہ عزیزانِ گرامی یہ دین کو نظام بنانے کی کوشش ، یہ اسلامی نظام کا نعرہ کہیں دین کے جسد سے اس کی روح نہ چھین لے۔ کہیں ایسی بات نہ ہو کہ جو جناب عیسیٰؑ نے ایک موقع کے اوپر کہی تھی کہ لوگو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لفظوں کو پکڑے رہو اور روح ختم ہو جائے۔ اس کا خیال رکھو کہ روح باقی رہتی ہے یا نہیں تو ایک بات جو ہے تو دین کے متعلق تو وہ یہ سمجھنی ہے اور ایک بات عزیزو دین کے متعلق سمجھنی ہے اور وہ یہ ہے کہ دین حق ہے، دین حقیقت ہے، دین کوئی نظریہ نہیں ہے دین تو گویا ایک معروضی حقیقت ہے۔ آپ انکار کریں یا اقرار کریں دین کی حقیقت آپ کے انکار یا اقرار، آپ اس کا انکار کرتے ہیں یا اس کا اقرار کرتے ہیں تو اس کا دین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دین تو ایک معروضی (OBJECTIVE) حقیقت ہے جس کو تجربہ بنایا جاتا ہے، یہ کسی فرد کے خیال یا کسی جماعت کے نظریئے سے وابستہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے دین کی شان یہ نہیں ہے کہ کچھ جماعتیں مانتی ہیں تو ٹھیک ہے اور دین ہے اگر وہ ماننا چھوڑ دیں تو وہ دین نہیں ہے۔ دین حق ہے، وہ کسی کا نظریہ نہیں ہے، نظریہ کیا ہوتا ہے؟ تم کسی کتاب کے اندر اٹھا کر دیکھ لو، ڈکشنری کے اندر آئیڈیالوجی کے معنی اٹھا کے دیکھ لو تو اس کے اندر تمہیں یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ وہ کسی نہ کسی کا آئیڈیا ہوتا ہے ، خیالات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے، ایک خاص نقطۂ نظر سے ایک بات کہی جاتی ہے تو اس کو نظریہ (IDEALOGY) کہتے ہیں، تو اب، دین اسلام کے متعلق ہم کیا کہیں۔ بھلا دینِ اسلام کس کا نظریہ ہے سوائے اس کے کہ یہ کہہ سکیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نظریہ ہے اور نظریہ تو دین ہو نہیں سکتا، گویا نظریہ جو ہے وہ ہمیشہ موضوعی (SUBJECTIVE) چیز ہوتی ہے، کسی نہ کسی انسان سے یا کسی جماعت سے تعلق رکھتی ہے، اس نظریہ کے اندر ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ نقطۂ نگاہ سے کہ اس کو دیکھا جاتا ہے لیکن حق ان باتوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ حق ایک معروضی حقیقت ہے ، حق جو ہے تو وہ اس دن سے قائم ہے بلکہ اس سے بھی پہلے قائم ہے جب سے زمین و آسمان کو قائم کیا گیا۔ حق تمہارے لئے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ تمہاری فطرت کو اس کے مطابق ڈھالا گیا اور تم اس بات کو

دیکھو کہ حق مطلق (ABSOLUTE) ہوتا ہے، نظریہ جو ہوتا ہے وہ ہمیشہ اضافی ہوتا ہے، کسی نہ کسی تعلق سے، کسی نہ کسی اضافیت سے وہ نظریہ متعارف ہوتا ہے۔ میں اس بات کو اور توضیح سے بیان کر دوں، میں عرض کر دوں کہ نظریہ کا مقابل ہمیشہ نظریہ ہوتا ہے، ایک نظریہ کا مقابل دوسرا نظریہ ہوتا ہے اور جانچنے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ کونسا نظریہ مفید ہے اور کونسا غیر مفید ہے، کونسا اچھا ہے اور کونسا برا ہے۔ لیکن حقیقت کے متضاد کوئی دوسری حقیقت نہیں ہوتی، نظریہ کا مقابلہ نظریہ سے ہوتا ہے اور حقیقت کا مقابلہ باطل سے ہوتا ہے۔ حقیقت کو جانچنے کا معیار وہ نہیں ہے جو نظریہ کو جانچنے کا معیار ہے، دین کو نظریہ کا مقابل نہیں کہا جا سکتا، دین کو اس طرح نہیں دیکھا جا سکتا کہ اسلام کو اگر آپ مان لیں تو اس میں اتنے فائدے ہیں اور کسی دوسرے نظریہ کو ماننے میں اتنے نقصان ہیں۔ اب نتیجہ خواہ کچھ ہو اگر آپ دین کو نہیں مانتے اور اپنے فائدے کی بات، دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے دنیا کے مختلف نظریات کو ٹٹولئے، دین کو اپنے بنائے ہوئے فائدے یا نقصان کے معیار سے مت جانچئے۔ دین کا فائدہ اور نقصان کا اپنا الگ معیار ہے۔ اسے دنیاوی نظریات کی طرح مت دیکھئے، اسلام اور دین کو حقیقت کے درجے سے نیچے لاکے ایک نظریئے کے درجے پر مت رکھیئے ورنہ ہمیں یہ بتا دیں کہ یہ دین کس کا نظریہ ہے، ہمیں تو سوائے خدا کے نظریئے کے اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

دین کو نظریہ کی سطح تک گرانے سے ایک اور غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی ہم لوگوں کے ایمان کی کمی کی بات ہے کہ آج جو ہمارے کلمے تھے وہ ہمارے نعرے بن گئے، اور ہمارا دین جو تھا تو وہ ہمارے لئے نظریہ بن گیا تو اگر ہم اس طریقے سے اس کا پروپیگنڈہ کریں کہ دیکھو دین تمہیں تمہارے فائدے کی بات سے نہیں روکتا، تم جاہ و مال اور عیش و عشرت کے طلبگار ہو تو دین میں بھی اس کی اجازت ہے۔ اگر تم دین کو مان لو تو وہ بھی تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے گا، گویا دین کا ایک طرح سے پراسپکٹس (PROSPECTUS) بنا کے یہ کہنا شروع کر دیں کہ دین تو تمہارے

فائدے کے لئے ہے تو اس موقعہ پر میں یہ عرض کروں کہ اللہ کے رسولؐ نے یہ بات
کہی کہ لا الٰہ الا اللہ پڑھو اور فلاح پاؤ، تو اللہ کے رسولؐ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ
جس فلاح کا تمھیں خیال ہے تو اس کو اگر تم حاصل کرنا چاہتے ہو تو لا الٰہ الا اللہ کہنا
شروع کر دو بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ تم لا الٰہ الّا اللہ کہو اس سے جو فلاح تم کو
حاصل ہوگی اصل میں وہی ہے جسے ۔ حقیقت سے تم فلاح سمجھتے ہو، وہ ایک عارضی چیز
ہے دیکھنے کی چیز ہے، تم دیکھو گے کہ وہ تھوڑے سے دن کے اندر وہ ختم ہو جائے گی ۔
یہ فلاح جو لا الٰہ الا اللہ کہنے سے حاصل ہوگی تو یہ قائم رہنے والی فلاح ہے ۔ اسی
طریقے سے یہ جو بات ہو جاتی ہے کہ ہمارا دین اور سیاست علیحدہ نہیں ہے ۔ تو عزیزو!
اس میں ایک بات یہ طے کرلو کہ اس سے تمھارا مطلب کیا ہے ۔ تمھارا مطلب یہ ہے کہ
ہم تو اپنے دین کے اوپر رہیں گے اور ہمارا دین جو کچھ بھی کہے گا اور جو کچھ بھی ہمارا
فرض ہوگا تو وہ ہم پورا کریں گے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہی سیاست سب سے بڑی ہے ۔
سب سے غالب سیاست جو ہے تو وہ یہی ہے ، یا تم یہ سمجھ لو کہ ہماری جو یہ سیاست
کے فائدے ہیں وہ دین کے نام پر حاصل کرو تو اس بات کے اندر فرق کرلو اور یہ فرق جو
ہے تو یہ تمھارے سامنے واضح ہو چکا ہے ۔ یعنی یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ دین کس کی
سیاست تھی اور یہ بھی تمھیں معلوم ہو چکا ہے کہ کس نے دین کو سیاست
کے لئے استعمال کیا اور اپنی سیاست کی وجہ سے دین کو کس نے
استعمال کیا، کس نے تباہ کیا اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ سیاست کا لوگوں
پر اتنا زبردست غلبہ ہوتا ہے کہ وہ بزرگ ہستیاں کہ جنھوں نے اپنے دین کو ہی
اپنی سیاست بنایا تو ان کو نعوذ باللہ ناکام کہا جاتا ہے ان کو سیاسی اعتبار سے ناکام
بنایا جاتا ہے تو یہ بات جو ہے تو یہ سمجھ لو کہ تمھارے سامنے وہ مثالیں ہیں جو اپنے راستہ
کے اوپر اڑے رہے ، جو اپنے راستہ کے اوپر صبر و استقلال کے ساتھ قائم رہے ،
تمھارے سامنے وہ ہستیاں جو ہیں تو وہ بھی موجود ہیں اور اس کا نتیجہ ؟ اور اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ جو دنیاوی کامیابی ہوتی ہے تو وہ بالکل ختم ہو گئی، لیکن اللہ کی راہ

میں یہ اپنی جان و مال کی قربانی، یہ دنیاوی فائدے کی قربانی کیا بے نتیجہ رہی؟ یہ بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نتیجے میں اپنے بندے کو وہ کامیابی عطا فرمائی جو انسانی وہم و خیال اور بندے کی توقعات کہیں زیادہ ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہی بات کہتا ہے۔ جس کی بات اس کو پسند آتی ہے جب وہ راضی ہو جاتا ہے تو وہ بدلہ دیتا ہے جو بندے کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا ہے، میرا مولا مجھے معاف کر دے تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں کہ شاید امام حسین علیہ السلام کو بھی اپنے اللہ پر یقین تو پورا تھا اور یہ تو بالکل معلوم تھا کہ وہ کامیاب ہو کر رہیں گے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہی وعدہ کیا ہے لیکن شاید وہ بھی یہ نہ سمجھ سکے ہوں کہ ان کی قربانی اس درجہ کامیاب رہے گی جس درجہ پر اللہ تعالیٰ نے واقعی اسے کامیاب کر کے بتا دیا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات ہمیشہ اپنے بندے کے توقعات سے زیادہ ہوتے ہیں وہ تو کہتا ہے نا کہ اس میں حساب نہ کرو۔ ہم دینے کے اوپر آتے ہیں تو بے حساب دیتے ہیں، تم جو کچھ بھی کرو گے تو اپنے حساب سے اندازہ لگاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تو بے حساب دینے والا ہے تو یہ بات جو ہے کہ دین تو ہمارے فائدے میں ہے اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے تو یہ دنیاوی فائدے یا نقصان کی بات نہیں ہے، اس میں سمجھنے کی بات جو ہے وہ یہ ہے کہ حقیقی مفاد اور حقیقی فلاح وہی ہے کہ جو دین کے اوپر چلنے سے حاصل ہوتی ہے اور تم جن چیزوں کو مفاد سمجھتے ہو، تم جن چیزوں کو اپنی فلاح سمجھتے ہو تم جس کے اندر اپنی بہتری سمجھتے ہو ان باتوں کی خاطر اور ان مقاصد کی خاطر دین کو استعمال کرنا (EXPLOIT) دین کے ساتھ ایک تمسخر ہے جیسا کہ خود قرآن میں کہا گیا ہے اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمسخر کرتا ہے تو اس بات کو سمجھ لو کہ یا تو دین تمہارے لئے سب کچھ ہے اور یا دین تمہارے لئے کچھ بھی نہیں ہے، کوئی بیچ کا راستہ (COMPROMISE) نہیں ہے کہ جو مفادات ہیں وہ بھی ہوتے رہیں اور دین بھی چلتا رہے، یہ بات تو یہ نہیں ہوا کرتی ہے اس لئے کہ اگر بندہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے تو وہ پوری طرح سپرد کرتا ہے، پھر وہ اپنے فائدے اور نقصان کے

متعلق اپنے معیار سے نہیں سوچتا بلکہ ہر حال میں رضائے الٰہی کا طالب ہوتا ہے کہ یہی بندے کا سب سے بڑا مفاد ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی فائدہ، فائدہ نہیں ہے۔

عزیزانِ گرامی! اب دین کے متعلق جو کچھ خوش فہمیاں ہیں ان کا جائزہ لینے کے بعد اب ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ دین کی تعلیم کیا ہے؟ اس تعلیم کا ایک خاکہ ہم سمجھ لیں خاص طور سے ایک تو یہ ہمارا فرض ہے کہ ان باتوں کو دہرا لیا کریں اور دوسری بات یہ ہے کہ اس خاکہ کو اگر ہم اپنے دماغ میں رکھیں گے تو بہت ساری باتیں سمجھ میں آجائیں گی تو پہلی پہلی بات جو ہے تو وہ یہ کہ دین ایک حقیقت کو تسلیم کرنا ہے، دین ایک حکم کو ماننا ہے، دین ایک راستے کے اوپر چلنا ہے، دین ایک بیعت ہے ایک کومٹمنٹ (COMMITMENT) ہے، ایک عہد ہے جو بندہ اپنے اللہ سے کرتا ہے اور وہ حقیقت کہ جو تسلیم کی جانے والی ہے وہ تو لا الٰہ الّا اللہ ہے اور دین کے احکام اور ضابطے جو ہیں تو ان کو ماننا محمدؐ رسول اللہ کا اقرار کرنا ہے، گویا اس بات کو ماننا کہ جو محمدؐ بن عبداللہ کا حکم ہے وہی محمدؐ رسول اللہ کا حکم ہے۔ میں نے حضورؐ کا نام دوبار لیا ہے۔ دو طرح سے آپؐ کے نام کا حوالہ دیا ہے لیکن میں ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں کر رہا۔ رسولؐ کی شخصیت میں مختلف خانے COMPARTMENTS نہیں ہیں، کہ اس کے احکام میں فرق کیا جائے، امتیاز برتا جائے کہ فلاں بات، اپنی مرضی سے کہی اور فلاں حکم اللہ کا حکم ہے۔ قرآن نے تو یہ بات کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم وہی ہے جو رسولؐ کا حکم ہے، ان دونوں میں تفریق مت کرو بلکہ میں تو عرض کروں کہ ہم تو خدائے محمدؐ کے ماننے والے ہیں، ہمارا جو خدا ہے تو وہ خدائے محمدؐ ہے۔ اور ہم اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ خدائے محمدؐ کے علاوہ اور سارے کے سارے خدا جھوٹے اور باطل ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دو باتیں تھیں ایک تو دین کے احکام، اس کی حکمت اور تعلیم تو وہ اس کتاب کے اندر ہے جسے رسولؐ لے کر آیا۔ تو رسولؐ ایک تو کتاب لے کر آیا اور ایک خود اپنے آپ کو لے کے آیا اللہ نے اسے بھیجا اور وہ نہ صرف صراطِ مستقیم کا ظاہر کرنے والا تھا، بلکہ بجائے خود صراط تھا، اب یہ دو باتیں ہوئیں، یعنی

ہماری ہدایت کے لئے ایک تو کتاب کی ضرورت ہے اور ایک اسوۂ رسولؐ ہماری ہدایت کا ذریعہ ہے۔ تمام روایتیں اسی طرف اشارہ کرتی ہیں یعنی ہدایت کی دو بنیادیں ہیں۔ کتاب اور سنت اور یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتیں، کتاب بھی اپنی جگہ باقی ہے، کتاب میں احکام ہیں، وہ احکام بھی موجود ہیں اور اسوۂ رسولؐ یعنی وہ راستہ جس پر انسانوں کو چلنے کی ہدایت کی گئی ہے وہ صراطِ مستقیم بھی باقی ہے اور اس صراط کے نشان جو تھے وہ بھی قائم ہوتے چلے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود رہبروں کی نشاندہی کرتے چلے گئے تو گویا ایک حکم کا ماننا، ایک حقیقت کو تسلیم کرنا اور ایک راستے کے اوپر چلنا یہی دین ہے۔ اس گفتگو میں صراط کا لفظ جب آیا ہے تو میں ایک بات اور عرض کروں ایک بات تو آپ یہ سمجھیں کہ ہمارا جو کلمہ ہے تو وہ کلمہ یہ نہیں ہے کہ سوائے اللہ کے کوئی اللہ نہیں ہے اور قرآن اس کی کتاب ہے بلکہ ہمارا کلمہ یہ ہے کہ سوائے اللہ کے اور کوئی اللہ نہیں ہے اور محمدؐ اس کا رسولؐ ہے، اور جس وقت ہم دعا مانگتے ہیں اور الحمد شریف پڑھتے ہیں تو اس وقت صراط کی جو ہم بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ دعا مانگو، ہماری ہدایت کر صراطِ مستقیم کی طرف اور وہ صراطِ مستقیم کیا ہے، وہ صراطِ مستقیم ان لوگوں کا راستہ ہے جس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے، گویا خود سورۂ فاتحہ کے اندر صراط کی جو تعریف کی گئی ہے وہ شخصیتوں کے ذریعے سے کی گئی ہے، صراطِ مستقیم کا تعارف کتاب کے ذریعے نہیں کرایا گیا بلکہ صراط کو شخصیتوں کے ذریعے پہچنوایا گیا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہے وہی صراط کی پہچان ہیں بلکہ وہ خود صراطِ مستقیم ہیں۔ تو یہ جو باتیں ہیں یعنی دین، دین جو ہماری بیعت ہے وہی ہمارا Commitment ہے دین ہماری ایک قسم ہے اور وہ قسم جو ہے وہ اس بات کی ہے کہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی اللہ نہیں ہے اور ہم اطاعت کرتے ہیں اس حکم کی کہ جو محمدؐ مصطفیٰ کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے اور ہم صراط کے اوپر چلتے ہیں کہ جس پر خود محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور محمدؐ نے جن کو بتایا وہ لوگ چلے جن کے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نازل ہوئیں تو دین جو ہے وہ تمام کا تمام ان تین چیزوں کے اندر ہے اس کے

باہر کوئی دین نہیں ہے، اب جہاں تک حکم کا تعلق ہے تمھیں جو حکم دیا گیا ہے تو وہ اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے تو اطاعت جو ہے تو وہ کتاب کے اندر جو حکم ہے وہ کرلو مگر اتباع کے لئے تو کسی انسانی نمونہ کا ہونا ضروری ہے، اطاعت تو کتاب کی ہوسکتی ہے مگر اتباع انسان کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اتباع کا مطلب ہے کسی کے پیچھے چلنا۔ اب اگر کسی کے پیچھے چلنا ہے تو وہ کوئی انسان ہی تو ہوگا جس کے پیچھے چلوگے تو جہاں تک کہ صراط کا تعلق ہے تو وہ بات اتباع کی بات ہے اور جہاں تک حکم کو ماننے کی بات ہے تو وہ اطاعت ہے۔ دین اطاعت بھی ہے اور اتباع بھی یعنی حق کو تسلیم کرنا، حکم کی اطاعت کرنا اور صراط کا اتباع کرنا مختصراً یہی دین ہے۔ تمھیں عبادت کے لئے پیدا کیا ہے جن ہو یا انسان مقصدِ تخلیق عبادت ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس لئے کرو کہ وہ رب الناس ہے عبادت کرنے کے جتنے داعیے ہوسکتے ہیں وہ سب موجود ہیں۔ اس کی عبادت یوں کرو کہ اس نے تمھیں پیدا کیا وہ تمھاری تربیت کرتا ہے وہ تمھاری پرورش کرتا ہے، ایک حال سے دوسرے حال پر تمھیں لے جاتا ہے۔ اسی لحاظ سے تمھیں رزق پہنچاتا ہے وہ تمام تمھاری ناقص چیزوں کو کامل کرنے والا ہے، اس لئے تم عبادت کرو کہ وہ رب الناس ہے، اور اس لئے عبادت کرو کہ وہ رب الناس ہے، اور اس لئے عبادت کرو کہ وہ ملک الناس ہے ہر طرح کی قدرت جو ہے وہ اس کے ہاتھ میں ہے، نفع ہو یا ضرر اس کے حکم کے بغیر تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ دنیا کے اندر کوئی تمھاری مدد نہیں کرسکتا، دنیا کے اندر تم کسی کو پکارو تو سوائے اس کے اور کوئی تمھیں جواب نہیں دیتا اور کوئی مدد کرنے کے لئے نہیں آئے گا ہر طرح کی قدرت اس کے لئے ہے بیدک الخیر تمام خیر جو ہیں تو وہ اس کے ہاتھ میں ہیں، اگر خیر کی تمھیں طلب ہے تو اس کے ہاتھ کی طرف دیکھو، یہ مت کرو کہ خیر کو جھپٹا مارنے اور غصب کرنے کی کوشش کرو تو اس وجہ سے تم عبادت کرو کہ وہ ملک الناس ہے، اس لئے عبادت کرو کہ وہ رب الناس ہے، اس لئے عبادت کرو کہ وہ ملک الناس ہے۔ اور آگے چل کر یہ کہا گیا کہ اس لئے عبادت کرو کہ وہ الہ الناس ہے، وہ ہے ہی عبادت کے قابل، عبادت کرنے کے جتنے

داعیے ہو سکتے ہیں، جتنے محرکات ہو سکتے ہیں وہ سب رب الناس ملک الناس،
الٰہ الناس کے اندر آجاتے ہیں کہ اس لئے تم اس کی عبادت کرو اور یہی تمھاری زندگی
کا مقصد ہے، اور تم اور تمھاری تعریف جو ہوتی ہے تو وہ اس کی عبدیت کے لحاظ سے
ہوتی ہے، بندے کا اور اللہ کا تعلق جو ہوتا ہے اس کو اگر تم علیحدہ کر دو تو پھر انسانیت
کی کوئی تعریف نہیں تمھاری تعریف یہ ہے کہ تم عبد ہو، اور عبد کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ عبد
کے پاس ہے وہ امانت ہے، جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس کے آقا کی امانت ہے، نہ تو
اس کی جائیداد اپنی ہے نہ اس کے ہاتھ پاؤں اپنے ہیں نہ اس کی عقل اور ذہن اس کے
اپنے ہیں، خاص طور پر اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ یہ عقل جس پر تم بہت نازاں ہو رہے ہو
ذرا یہ تو دیکھو کہ تم کہ جن کی ہم عمر بڑھا دیتے ہیں اور وہ ارذل العمر کو پہنچ جاتے ہیں تو
اس وقت ان کی عقل کو کیا ہو جاتا ہے اور اگر یہ عقل ان کی ملکیت تھی تو اب وہ عقل
کدھر چلی گئی، اب وہ عقل کیا ہوئی تو اس طریقے سے جو کچھ بھی بندے کا ہے، جو کچھ
بندے کے پاس ہے تو وہ اس کے آقا کا ہے، یہی عبدیت کا مقصد اور منشا ہے اور یہ جو بات
ہوتی ہے کہ پراپرٹی کا کیا تصور ہے ہے جائیداد کا کیا تصور ہے ؟
اسلام کے اندر تو عزیزو جائیداد کا جو اسلام کے اندر تصور ہے اس کا ہم پانچ وقت نماز
میں اظہار کرتے ہیں کہ ہم تیرے عبد ہیں اور عبد کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کے پاس اپنا
کچھ نہیں ہوتا کچھ جائیداد اس کے اپنی نہیں ہوتی اور پھر صورت جو ہے تو وہ یہ کہ جو
کچھ بھی ترقی کا راستہ ہے وہ اس عبدیت کے اندر ہے جتنا زیادہ تم اپنے آپ کو
اللہ کے سپرد کرو گے اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ شرفِ قبول تمھیں بخشتا رہے گا، اگر
تمھارے ہاتھ اور تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں وہ سب کی سب تم نے اللہ تعالیٰ
کے سپرد کر دیں تو پھر تم اُذن اللہ بن جاؤ گے، تو پھر تم عین اللہ بن جاؤ گے، تو
پھر تم ید اللہ بن جاؤ گے، یہ عبدیت کے مقامات ہیں۔ یہی اصل عبدیت ہے۔ اور یہ
عبدیت کے مقامات اس کے لئے ہیں کہ جس کا کان جو تھا وہ بھی اس کا نہیں تھا، اور
جس کا ہاتھ جو تھا وہ بھی اس کا نہیں تھا اور جس کی آنکھیں جو تھیں وہ بھی اس کی

نہیں تھیں، سب کی سب وہ خدا کو بیچ چکا تھا تو اس وجہ سے وہ خود عین اللہ بن گیا اور ید اللہ بھی بن گیا اور وہ اذن اللہ بھی بن گیا۔

چونکہ اللہ نے انسان میں اپنی روح سے پھونکا ہے اس لئے انسان کا شرف یہ ہے کہ اس کا سر سوائے اللہ کے کسی کے آگے نہیں جھکتا، اللہ کے سوا کسی کے سامنے سرنگوں نہ ہونا یہی انسانیت کی پہچان ہے، انسانی شرف اور انسانی آزادی کی ضمانت اسی میں ہے کہ انسان بس ایک اللہ کے حکم کے تابع ہو۔ اگر اس کے حکم کے تابع ہوئے تو پھر تمام دوسرے آقاؤں کی غلامی سے نجات مل جائے گی۔ اس طرح سے توحید کا عقیدہ انسانی عظمت اور حریت کی اساس ہے اور جب تمام انسانوں کا خالق ایک ہے تو انسانوں میں باہمی مساوات ہے، اپنے خالق کے حوالے سے انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ انسان انسان کا احترام اس لئے کرے کہ ان سب کا خالق ایک اللہ تعالیٰ ہے اور پھر جس وقت کہ لوگ مقصد میں ایک ہو جائیں تو ان میں اخوت قائم ہوگئی، پھر وہ ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے اور چونکہ اللہ تعالیٰ بڑا رحمان ہے اور رحیم ہے بار بار اگر تم گناہ کرو گے لیکن صدقِ دل سے اسکی طرف آؤ گے تو وہ تمھاری توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔ جہاں حمد کا راستہ اس نے بتا دیا ہے تو وہاں توبہ کا بھی راستہ اس نے تمھیں بتا دیا ہے اور جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے تمھیں دیا ہے وہ اس کے راستے میں خرچ کرو۔ میں مختصر لفظوں کے اندر یہ کہہ دوں کہ کافر اور مومن میں فرق جو ہے تو وہ یکنزدن اور ینفقون کا ہے یعنی کون مال جمع کر کے رکھتا ہے اور کون اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو یہ انفاقِ مال بلکہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے تمھیں دیا ہے اس لئے کہ رزق کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہو تو وہ اللہ کے راستے میں تم خرچ کر دو، اب یہ دو باتیں جو ہیں انھیں ذہن میں رکھو یعنی ایک صلوٰۃ (نماز) اور ایک انفاق یعنی خرچ کرنا اللہ کے راستے اور اقام الصلوٰۃ کو قائم کرنی ہے، تو اس صلوٰۃ کو قائم کرنے کے تقاضے تو تم دیکھو، صلوٰۃ کو قائم کرنا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ملک کے اندر اللہ اکبر کی آواز فضا میں گونجے تو اس ملک کے اندر کوئی اور دوسرا بت، یا کوئی دوسرا خدا نہیں ہونا چاہیے

جس وقت کہ اللہ اکبر کی آواز کسی ملک کی فضا میں گونجتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے بندے اور یہاں رہنے والے وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے ہوا و ہوس کے غلام نہیں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو کسی ظالم و جابر کے سامنے گردن نہیں جھکاتے، یہاں کے لوگ وہ ہیں کہ جب شیطان دولت کے ڈھیر دکھا کے اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے تو اس کی طرف رخ نہیں کرتے، یہ تو وہ ہیں کہ جو ہر وقت اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو قیام صلوٰۃ یعنی یہ بات جو کہی ہے کہ اس ملت کو اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ قیام صلوٰۃ کریں تو قیام صلوٰۃ کا مطلب یہ ہوا کہ تمام کے تمام جھوٹے خداؤں کی نفی کی جائے، ان کو ختم کیا جائے جس سرزمین کے اوپر جھوٹے خداؤں کی عبادت ہوتی ہو تو اس جگہ قیام صلوٰۃ ممکن نہیں ہے، یوں پڑھنے کو تو ایک آدمی نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن قیام صلوٰۃ کا مطلب کچھ اور ہے، قیام صلوٰۃ کے لئے پہلے باطل خداؤں سے انکار ضروری ہے، اور عزیز و امام حسینؑ کی زیارت میں ہم جو یہ بات کہتے ہیں کہ ہم اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اے حسینؑ تو نے نماز کو قائم کیا، تو نے زکوٰۃ دی اور تو نے معروف کا حکم دیا، تو نے بری باتوں سے روکا تو تم یہ تو دیکھو کہ اقام صلوٰۃ کی راہ میں کون کون سی دشواریاں ہوتی ہیں کیسی مشکلات سامنے آتی ہیں تو پھر تم یہ بات دیکھو گے کہ یہ جو امام حسین علیہ السّلام نے بیعت سے انکار کیا، یہ اقام الصلوٰۃ کی پہلی منزل ہے، یہ جو بات کہی گئی کہ یہ ملت اسلئے ہے کہ یہ قیام صلوٰۃ کرے تو قیام صلوٰۃ کی پہلی منزل جو ہے تو وہ یہ ہے کہ ظالم و جابر کی بیعت سے انکار کیا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ (واقعی) نماز کس کو کہتے ہیں، نماز کو کس طریقے سے قائم کیا جاتا ہے۔ اور عزیز و صفین میں جب معرکۂ کارزار گرم ہے اور نماز کے لئے سجادہ بچھایا جاتا ہے، صفین کی لڑائی میں سجادہ بچھ جائے اور پھر جب لوگ کہیں کہ یہ کون موقعہ ہے اور یہ کون سا محل ہے نماز کا تو اس پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہی قیام صلوٰۃ ہے، یہ قیام صلوٰۃ ہے یہ نماز قائم کرنا ہے اسی کے لئے تو لڑائی ہو رہی ہے۔ میں محض ایک بات پوچھتا ہوں کہ کیوں عزیز و کیا دوسری طرف کے لشکر والے نماز نہیں پڑھتے تھے، یہ جناب امیرالمومنینؑ جو سجادہ بچھائے بیٹھے ہیں

میدانِ صفین کے اندر تو کیا ان کے مخالف لشکری نماز نہیں پڑھتے تھے لیکن اس نماز پڑھنے کو اس رسمی نماز پڑھنے کو قیامِ صلوٰۃ نہیں کہہ سکتے، قیامِ صلوٰۃ کے معنی کو مسخ مت کرو اس لئے کہ یہ قیامِ صلوٰۃ امام حسینؑ نے کی، قیامِ صلوٰۃ تو امیرالمومنینؑ نے کی اور یہ قیامِ صلوٰۃ کی بات کافروں کے نرغے کے اندر نہیں تھی یہ ان لوگوں کے مجمع کے اندر تھی کہ جو نماز پڑھنے کے مدعی تھے، جو نماز پڑھا کرتے تھے عزیز و اس بات کو سمجھ لو کہ بندۂ شاہ پرست کی نماز شرک کا ایک طریقہ ہے، یہ سمجھ لو کہ زر پرست جو ہوتا ہے اس کا مالِ زکوٰۃ نکالنا یہ خود رجس ہے اور یہ خود گندگی ہے، تو یہ بات جو ہے یہ اقامِ صلوٰۃ کی بات ہے اور یہ اقام الصلوٰۃ کی بات قائم کی گئی، ایسے ایسے موقعوں پر نماز پڑھی کہ لشکرِ مخالف سے تیر آرہے ہیں اور امام حسین علیہ السّلام کی صف بچھی ہوئی ہے، اور پھر اقام الصلوٰۃ کی وہ منزل بھی ہے کہ جس وقت امام حسین علیہ السّلام شہید ہونے والے ہیں اور ظہر کے وقت تو اور لوگ موجود بھی تھے، لوگوں نے اپنے سینے پر تیر بھی کھائے لیکن یہ عصر کا وقت جو ہے تو عصر کے وقت سوائے امام حسین علیہ السّلام کے اور ایسی حالت میں اور کوئی بھی نہیں ہے، اور سجدہ کیا جو قیامت تک جاری رہے گا، کیونکہ وہ سجدہ تو ابھی ختم نہیں ہوا۔ ⁂

ساتویں مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ

تمام حمد اس اللہ کو جس نے کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا، لہو ولعب کے طور پر پیدا نہیں کیا، باطل پیدا نہیں کیا حق کے ساتھ پیدا کیا، ایک وقت کے لئے پیدا کیا، جو وقت معین ہے جو اسے معلوم ہے اور ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا جس کو اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے اپنے مصطفٰی و مجتبٰی بندوں کے ذریعے انسانوں کے اوپر واضح کیا، اس نے انسانوں کو آنکھیں دیں تاکہ وہ گرد وپیش کے حالات کو دیکھ سکے۔ فطرت کی جو دنیا ہے تو اس سے واقف ہو اس نے انسان کو کان دیئے تاکہ جو باتیں گزر چکی ہیں ان کو اچھی طرح سے سمجھے، عالم تاریخ سے واقف ہو اور اس نے سمجھنے والا قلب دیا تاکہ ان باتوں سے موعظت اور نصیحت حاصل کر سکے، اور اس نے انسان کے نفس کو فجور و تقویٰ، اپنی برائی اور بھلائی کا الہام کیا، اپنی برائی اور بھلائی میں تمیز کرنے کا ایک خاصہ اس کو دیا تاکہ جب اللہ کے رسولؐ، اللہ کے مصطفٰی و مجتبٰی بندے ہدایت کے لئے آئیں تو جس نے اس آواز پر لبیک کہا اور اس بتائے ہوئے راستے کے اوپر چلا اس کیلئے نجات اور فلاح ہے اور جس نے اس سے انکار کیا اور اس ہدایت کے راستے میں کا وٹیں ڈالیں اس کے لئے ہلاکت و تباہی ہے تاکہ اس ہدایت آنے کے بعد جس کی نجات ہو وہ بیّن اصولوں کے اوپر نجات ہو اور جس کی ہلاکت ہو وہ بیّن اصولوں کے اوپر ہلاکت ہو اور بیشک سزا وجزا کے دن کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور میں درود بھیجتا ہوں محمد مصطفٰی پر جس کو اللہ نے بشیر و نذیر بنا کے بھیجا رب العالمین نے رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجا، اس نے لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا تاکہ وہ ان باتوں سے بچیں جن کے نتیجہ میں وہ عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں اور اس نے لوگوں کو بشارت دی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت

کے امید وار ہوسکیں، اس کے ساتھ کتاب آئی، اس کے ساتھ صراط آئی اس نے صراط کے اوپر چل کر خود یہ بتایا کہ دنیا کے مختلف ٹیڑھے راستوں میں سیدھا راستہ کون سا ہے، وہ راستہ جو بندے کو اللہ تک پہنچانے والا ہے، اور میر اسلام ہوا ائمہ ہدیٰ پر جو اس شریعت محمدیؐ کے محافظ بن کر اس کے نگہبان بنے، وہ کہ جو بولتا ہوا قرآن اور مجسّم اسلام ہیں وہ کہ جنھوں نے اپنی زندگی میں اسلام کی مختلف شانیں دکھلائیں یہاں تک کہ اسلام کی جتنی بھی شانیں ہوسکتی تھیں، جتنے ظہور کے طریقے ہوسکتے تھے وہ سب کے سب ہمارے سامنے آگئے یہاں تک کہ سب سے بعد میں غیبت کی شان جو ہے تو وہ بھی ہمارے سامنے آگئی۔

عزیزانِ گرامی! گذشتہ تقریر میں میں کچھ دین کے متعلق عرض کر رہا تھا اور کچھ غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں جو دین کے متعلق ہیں تو ان کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے یہ بات کہی کہ دین جو ہے تو وہ کوئی نظام نہیں ہوتا، کوئی نظریہ نہیں ہوتا، دین کے اندر لوگوں کا فائدہ ہے لیکن اپنے فائدے کے لئے دین کا استحصال نہیں کیا جاسکتا حالانکہ ہمیشہ یہ استحصال ہوتا رہا ہے، اور میں نے یہ بات عرض کی تھی کہ اقام الصلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی منزل کونسی ہوتی ہے ایک تو محض رسم کو پورا کرنا ہوتا ہے لیکن اقام الصلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی معنویت کے اندر آپ غور کرنے ہیں اس کو واقعی سمجھنا چاہئے ہیں اس کی حقیقت کو دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر یہ بڑی دشوار گزار منزل ہے، ایک جملہ میں عرض کروں کہ بندۂ شاہ کی نماز شرک ہوتی ہے اور بندۂ زر کی زکوٰۃ مال کی تطہیر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود رجس ہے شیطان کا۔ اور اس ایتائے زکوٰۃ اور قیام صلوٰۃ کی منزل کس کس طرح سے چلتی ہیں، اور کیا کیا دشواریاں اس کے اندر آتی ہیں، میں نے ان باتوں کو ارادتاً نہایت اختصار سے پیش کیا تھا۔ چند احباب کی خواہش کے پیش نظر اور اپنے موضوع کی وضاحت کی ضرورت کے خیال سے میں آج کی گفتگو میں ان باتوں کی کچھ وضاحت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس تفصیل کے اندر بھی بہت اختصار سے کام لوں گا اور جو ضروری بات ہے، جو ضروری مسئلہ ہے تو اس کی تھوڑی بہت وضاحت کی ضرورت ہے، اس کو آپ اسطرح

سے دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جس وقت بعثت ہوئی تو اسوقت عرب کے اندر ایک خاص نظام جس کو قبائلی نظام کہتے ہیں تو وہ رائج تھا، کچھ شہر جو بڑے شہر تھے اور مکہ ان میں ایک تھا تو وہ تجارت کا بڑا مرکز تھا، بہر حال نظام جو تھا تو وہ تو تھا ہی قبائلی ، قبائلی نظام کے بعد ارتقار کا جو نمبر آتا ہے وہ آتا ہے مرکزی حکومت کا قیام مرکزی حکومت کا قیام ہونا وہ ہمیشہ ایک ارتقار ہوتا ہے قبائلی نظام کا، اس لئے کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے یہ ہوا کہ لوگوں کو اتحاد کا سبق ملا اور ان کے جو قبائلی رسوم ورواج تھے، اس کے اندر قبائلی نظام کے اندر اب اس کی جگہ قانون نے لے لی، شریع نے لے لی جس وقت کہ قانون رسوم ورواج، کی جگہ لے لیتا ہے تو مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے، اس مرکزیت کی صورت نے ایک بادشاہت کی صورت اختیار کی اور ایک عرصے تک بادشاہت جو تھی تو اس کا دور دورہ رہا، اس طریقے سے کہ اس زمانے میں اگر یہ بات کہتے کہ بادشاہت کے علاوہ بھی سوسائٹی اور حکومت کی کوئی صورت ممکن ہے تو کوئی اس کا یقین نہیں کر سکتا تھا، ایک چھوٹے سے ملک یونان میں جمہوریت بھی چلی تھی مگر وہ چھوٹے چھوٹے سٹی اسٹیٹ تھے ( ) .
مگر یہ کوئی نہیں سوچ سکتا تھا کہ بغیر مرکزیت کے اور بادشاہت کے ایک بڑے ملک کا نظام سکتا ہے، اس کے بعد پھر جمہوریت کا دور آیا، اور جس وقت کہ بادشاہت کا دور دورہ ہوا تو اس وقت تو ہم نے یہ کہا کہ بادشاہ تو ظل اللہ ہوتا ہے، بادشاہ تو اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے، زمین کے اوپر اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا بلکہ یہ بات کہی گئی کہ جس طریقے سے عالم تکوین کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو اسی طریقے سے اس کا نائب، اس کا سایہ اور اس کا ظل زمین کے اوپر بادشاہ کی ذات ہے جس طریقے سے اللہ تعالیٰ کے بغیر کائنات کا تصور محال ہے اسی طریقے سے بادشاہ کے بغیر اس دنیا کا اور دنیا کے نظام کے چلنے کا تصور محال ہے۔

نظام کیوں بدلتے ہیں؟ یہ بالکل الگ بات ہے، بہر حال یہ دیکھیں کہ نظام بدلتے رہتے ہیں، ہم نے یہ کیا کہ جو نظام آیا اس کے جواز میں قرآن شریف میں سے کچھ نہ کچھ آیتیں

نکال کر اس کی تعریف کرنا شروع کر دی جس وقت کہ بادشاہت کا نظام دنیا کے اندر تھا تو
بادشاہ جو تھا تو ظل اللہ تھا جس وقت کہ بادشاہ کے نظام کو دنیا نے مسترد کر دیا اور جمہوریت
کا بہت زور ہوا تو اس وقت یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام میں تو ہمیشہ سے جمہوریت ہے اور
ہمارے یہاں شوریٰ ہے تو شوریٰ سے تمام کی تمام باتیں طے ہوتی ہیں، یہ لوگ تو آج جمہوریت
کا ڈنکا پیٹ رہے ہیں، اور ہمارے یہاں تو چودہ سو برس سے جمہوریت چل رہی ہے، اور
ہمارے یہاں تو حالت یہ تھی کہ ایک بوڑھی عورت کھڑی ہو کے حاکم وقت کو ٹوک سکتی تھی۔
تو ہمارے یہاں اس درجہ کی جمہوریت تھی تو اس قسم کی بات جو ہے تو وہ کہی گئی حالانکہ یہ
جمہوریت کی بات نہیں تھی، یہ تو وہی قبائلی طریقہ تھا، اب بھی قبیلے کا جو سردار ہوتا ہے اس پر
معمولی سے معمولی آدمی اس کے پاس جا کر نکتہ چینی کر سکتا ہے اور سوال کر سکتا ہے تو اب
ہمارا موقف یہ ہو گیا کہ جمہوریت ہمارے یہاں موجود ہے پھر اس کے بعد آپ میں سے جو جوان
ہیں انھوں نے تو ہٹلر کا زمانہ نہیں دیکھا ہے۔ میں عمر کی جس منزل میں ہوں تو میں نے وہ
زمانہ دیکھا ہے۔ جب ہٹلر اور مسولینی جیسے بڑے بڑے آمر دنیا کے اندر ابھرے، تاریخ
کے اندر ابھرے اور ان کا بڑا دبدبہ تھا یعنی ایسا کہ ان کے منہ کے الفاظ ہی نہیں بلکہ وہ جس لہجہ
میں گفتگو کرتے تھے تو وہ لہجہ دنیا کی تاریخ بن جاتا تھا، تو یہ کیفیت تھی کہ اب جب اس طرف
لوگ راغب ہوئے تو ہم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جماعت کی تنظیم اور اطاعت امیر
کا تصور (I E A) تو ہمارے ہاں ہمیشہ سے موجود ہے، ہماری تو نماز کے اندر بھی جماعت
کی بات ہے اور ہمیں تو یہ درس دیا جاتا ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھا رہا ہے اور سب اس کے پیچھے
پڑھ رہے ہیں، جب وہ جھکتا ہے تو سب جھک جاتے ہیں اور سجدے میں جاتا ہے تو سب سجدے
میں چلے جاتے ہیں گویا ہم نے آمریت کو اسلام کے مطابق کہنا شروع کر دیا، اس طرح آپ دیکھیں
کہ کسی نظام کے ساتھ اسلام کو وابستہ کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور پھر جس وقت کہ
کمیونزم کا زور ہوا اور اس کا دور دورہ ہوا تو ہم نے یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام کے اندر تو مساوات
پہلے سے موجود ہے بلکہ اکثر ہمارے بڑے مفکرین نے یہ فارمولا بتایا کہ بس کمیونزم کے
اندر اللہ تعالیٰ کو جوڑ دو تو وہ اسلام ہو گیا یعنی یہ فارمولا جو ہے تو وہ آپ کو معلوم ہے

کہ یہ بہت عام ہوا کہ جو ذرا ترقی پسند خیالات کے مسلمان تھے تو انھوں نے کہا کہ کمیونزم اور اسلام میں فرق ہی کیا ہے بس یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو کمیونزم میں اور داخل کر دیا جائے تو وہ سب کا سب اسلام ہو جائے گا۔ اب یہ جو بات تھی تو وہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ کوئی داخل کرنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ تو سب پر محیط ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز ہے اس میں ایک اللہ تعالیٰ کا (APPENDIX) اینڈکس اور جوڑ دو، تمھارے فارمولے کے مطابق کمیونزم اسلام بن جائے گا، مگر یہ باتیں ہم کرتے رہے اور اب بھی یہ باتیں ہوتی ہیں۔ چونکہ اب وہ آمریت کی بات تو ذرا ختم ہوئی حالانکہ اب بھی آمر ہوتے ہیں اس لئے کہ جس جگہ ذرا جمہوریت ناکام ہوتی ہے وہاں آمریت پیدا ہو جاتی ہے مگر اب ہم نے یہ شروع کر دیا ہے کہ جمہوریت جو ہے تو وہ اسلام کے نزدیک ہے۔

اب میں آپ سے یہ عرض کروں کہ اگر ہم کچھ نظاموں کے اندر اسلام تلاش کرتے ہیں تو وہ کونسا نظام ہے کہ جس کو آپ کہیں گے کہ یہ اسلام کا نظام ہے اور اگر آپ یہ بات کہتے ہیں کہ جمہوریت اسلام کا نظام ہے تو میرے عزیزو مجھے بتاؤ تو سہی کہیں دین کی تاریخ کے اندر اسلام کی تاریخ کے اندر، مسلمانوں کی تاریخ کے اندر تم خدا کے لئے انصاف کرو اور اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھو کہ یہ جمہوریت کس جگہ تھی، کس وقت یہ بات تھی کہ حکومت اور حاکم کا فیصلہ خفیہ رائے شماری کے ذریعے ہوتا، لوگ ووٹ کے ذریعے حاکم چنتے اور عوام کی رائے حرفِ آخر ہوتی تو اس طرح سے ہم گمراہی کے اندر پڑ جاتے ہیں، الجھنوں کے اندر پڑ جاتے ہیں، اس کے اندر طرح طرح کی تاویلیں کرنی شروع کرتے ہیں، طرح طرح کی تفسیریں شروع کرتے ہیں تو ایک تو یہ دقت آ جاتی ہے اور ایسی الجھن کہ جس سے ہم نکل سکتے ہیں اور ایک آدمی دوسرے آدمی کو الجھانا شروع کرتا ہے اور آپس میں بحثیں شروع ہوتی ہیں کہ جو بحثیں ہمیں کسی نتیجہ تک نہیں لے جاتی ہیں، اب یہ کہا جا رہا ہے کہ جمہوریت میں صدارتی طرزِ حکومت (PRESIDENTIALFORM) اسلام کے زیادہ نزدیک ہے، یہ باتیں جو ہیں تو وہ ہوتی رہتی ہیں اور اللہ والے ہر زمانے میں رہے اور صحیح اسلامی شعائر بھی ہر زمانے میں موجود رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں میں کوئی اتنا بڑا انقلاب تو نہیں آیا جیسے کہ اور ملکوں کے اندر آیا وہ

اس وجہ سے کہ ہمارے یہاں اطاعتِ امیر کا ڈھول بہت پیٹا گیا اور یہ بات کہی گئی کہ جو کوئی تخت کے اوپر بیٹھا ہوا ہے خواہ وہ کسی طریقے سے تخت کے اوپر بیٹھا ہو وہ نامزدگی کے ذریعہ سے آیا ہو وہ کچھ اہلِ مشاورت کہلاتے ہیں ان کے مشورے سے آیا ہو یا ایک فوجی ٹولے جس کو آج کل کی زبان میں جنتا (JUNTA) کہتے ہیں تو اس کے فیصلے سے وہ تخت کے اوپر آیا ہو یا وہ تخت کے اوپر استیلاء غلبے کے ذریعے آیا ہو، جو کوئی بھی ہو، وہ کسی طریقے سے تخت پر آیا ہو، جب وہ تخت پر قابض ہوگیا تو اولوالامر بن گیا، اس کی اطاعت ہمیشہ کرنی چاہیئے تو اس رجحان کی وجہ سے اس اطاعتِ امیر کی توجہ سے ہماری تاریخ میں اب تک بہت زبردست انقلابات تو نہیں آئے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ہر دور میں ایسے لوگ رہے، ہر دور میں اللہ ایسے لوگوں کو اٹھاتا ہے، اسی امت میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جو ظلم کو ظلم کہتے رہے، جو حکمرانوں کے ظلم وستم کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

اب ایک سوال جو تمام بحث کو اٹھاتا ہے وہ سوال یہ ہے کہ آخر ہمارا ایک عقیدہ ہے حکومت کے بارے میں ہمارا کیا تصور ہے! تو حکومت کے کسی مخصوص نظام یا نظریئے سے یہاں بحث نہیں ہے، یہاں ہم بلا کم و کاست جو شیعوں کا عقیدہ ہے تو وہ آپ کے سامنے عرض کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم یہ بات سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا کی اور دنیا والوں کی سعادت ہے کہ جو امامِ وقت ہو وہی حاکمِ وقت ہو، جہاں تک امام کا تعلق ہے تو اس کی امامت کے لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ حاکم بھی ہو، دنیا کے اندر بہت سارے انبیاء ہوئے، چند انبیاء ایسے تھے کہ جن کو حکومت بھی حاصل ہوئی اور بہت سارے انبیاء بلکہ زیادہ تر انبیاء کو حکومت حاصل نہیں ہوئی تو حکومت حاصل نہ ہونا ان کی نبوت کی شان میں کوئی کمی نہیں کرتا تو اسی طریقے سے اگر فرض کرو کہ امام حاکم نہیں ہے تو اس کے امام کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں یہ البتہ لوگوں کی سعادت ہے کہ امام جو ہے تو وہ حاکم ہو اور میں کہتا ہوں کہ یہ سعادت ہے   میں اس وجہ سے کہتا ہوں کہ یہ معیار ہمیں کلامِ پاک نے دیا ہے اور ہمیں یہ بات بتائی گئی ہے کہ جس وقت بنی اسرائیل کے اندر قاضیوں کا دور ختم ہوا اور بادشاہوں کا دور ختم ہوا تو لوگوں نے اس زمانے کے نبی جو سموئیلؑ تھے تو ان سے یہ

بات کہی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ ہونا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کی اور انھوں نے طالوت کو بادشاہ بنایا اور طالوت کے متعلق یہ بتایا گیا کہ طالوت اس لئے بادشاہ ہیں کہ وہ جسم اور علم میں بڑھے ہوئے ہیں۔ قرآن کے الفاظ جو ہیں تو وہ یہ ہیں۔ آگے چل کے جس وقت کہ جناب داؤد نبی اسرائیل کے اندر ایک بہت بڑے بادشاہ ہوئے تھے تو ان کے متعلق یہ بات کہی گئی کہ "اور ہم نے داؤد کو ملک دیا اور حکمت دی" تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس وقت ملک اور حکمت جمع ہوتی ہیں تو یہ انسانوں کے لئے اور دنیا والوں کے لئے بہترین صورت ہے، اور میں نے جو یہ بات آپ سے کہی تو یہ کلام پاک کی آیات سے اخذ کی ہے، اور میں آپ سے عرض کروں کہ حکماء اور فلاسفرز جو ہیں تو وہ بھی اسی نتیجے تک پہنچے ہیں، چنانچہ افلاطون کے نزدیک بھی حکومت کی بہترین صورت یہ ہے کہ جو حاکم ہو وہ حکیم بھی ہو، جو تخت کے اوپر بیٹھا ہو اسے حکمت بھی اس کے اندر ہونی چاہیئے۔ یہ وہی بات ہے کہ جو وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ ہم نے داؤد کو ملک دیا اور حکمت دی تو اس وجہ سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سب سے بڑی بات یہ ہے لوگوں کے لئے سب سے زیادہ مفید بات یہ ہے کہ ملک اور حکمت ایک جگہ جمع ہو جائیں اسی لئے ہم کہتے ہیں لوگوں کے لئے سب سے بڑی سعادت اور فلاح کی صورت یہ ہے کہ امام جو ہے وہ حاکم وقت بھی ہو۔ اچھا اب اور آگے چلیں اور اس کو بھی آپ ذرا دیکھیں اور یہ منزل جو ہے تو وہ بہت نازک منزل ہے، آپ یہ بات دیکھیں کہ ایسا بھی وقت آیا کہ جناب امیرالمومنینؑ جو ہمارے عقیدے کے مطابق امام ہیں، نبیؐ کے جانشین ہیں تو وہ حاکم وقت بھی ہوئے۔ اب اعتراض کرنے والا جو یہ بات کہتا ہے کہ جس وقت کہ امامؑ حاکم وقت ہوئے تو ان کے کیا کارنامے ہیں۔ اچھا اس بات کو تو چھوڑیں کہ انھوں نے کیا کارنامے دکھائے کیا نہیں یہ تو میں اپنی ایک تقریر میں بتا ہی چکا ہوں کہ کس لحاظ سے اور کس معنی میں جناب امیرالمومنینؑ کامیاب ٹھہرے یہاں اس بحث کو تو آپ چھوڑ دیں اس بات کو دیکھ لیں کہ وہ ملک جو ہے تو وہ کس طرح سے امام تک پہنچا ہے، ایک بڑی بات جو ہے وہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مدینے میں تمام افراتفری کا عالم ہے، انارکی پھیلی ہوئی ہے، کوئی آدمی نظر نہیں آتا جو اس صورتِ حال پر قابو پا سکے اور لوگ جو ہیں وہ مجبور کر رہے ہیں جناب امیرالمومنینؑ کو کہ

آپ خلیفہ بن جایئے ، جناب امیرالمومنینؑ نے ان سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں یہاں تک کہ اس کشمکش کے اندر آپ کی چادر بھی پھٹ گئی اور آپ کے صاحبزادوں یعنی جناب حسنینؑ علیہم السّلام کے اوپر بھی لوگوں کا بڑا جھکاؤ ہوا بالآخر آپ نے خلیفہ ہونا منظور کر لیا۔ تو تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس طرح جناب امیرالمومنینؑ کے ہاتھ لوگوں نے خلافت کی بیعت کی اور ان کو حاکم تسلیم کر لیا۔

عزیزانِ گرامی! یہاں ایک بات میں عرض کروں اور وہ یہ کہ امامؑ یا رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت جو ہوتی ہے تو پہلے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ امام ہیں یہ رسولؐ ہیں اس کے بعد بیعت ہوا کرتی ہے ، بیعت کے ذریعے سے کوئی امام یا رسول نہیں ہوا کرتا ، یہ نہیں ہوتا کہ ہم تمہاری بیعت کر لیں تو تم رسولؐ ہو گئے نبی ہو گئے یا امام ہو گئے ، یہ بات نہیں ہوا کرتی امامت کی جو بیعت ہوتی ہے تو اس میں پہلے تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ امام ہے اور چونکہ وہ امام ہوتا ہے اس لئے ہمارے اوپر اس کی اطاعت فرض ہے ، پھر اس کے بعد اس کی بیعت کی جاتی ہے ، ساتھ ہی ذرا میں اس بات کو واضح کر دوں ، یہ بات غور کرنے کی ہے کہ کہ خلافت جو ہے تو وہ بڑا مقدس فریضہ ہے ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشا ہوا فریضہ ہے ، اور اللہ تعالیٰ کا بخشا ہوا منصب عظیم ہوتا ہے ۔ لائقِ احترام ہوتا ہے ، یہ وہ ناموسِ کبریٰ ہے نہ جس کی تحقیر کی جا سکتی ہے نہ جسے رد کیا جا سکتا ہے ، اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو اس ناموسِ کبریٰ کا امین بناتا ہے ، جسے اس عظیم منصب پر فائز کرتا ہے وہ اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا ۔ وہ اسے دوسرے کو حوالے نہیں کر سکتا ، مگر دنیاوی طریقے سے حاصل کی ہوئی خلافت ، خلافتِ الٰہیہ نہیں ہے ۔ اب میں چند جھلکیاں آپ کو تاریخ سے دکھاتا ہوں ، اور وہ یہ ہے کہ جناب امیرالمومنینؑ مرمت کر رہے ہیں اپنے کفش کی اور ان سے ابنِ عباسؓ یہ کہہ رہے ہیں کہ مولا اب تو اس جوتے کی کوئی قیمت نہیں اس کی آپ کیا مرمت کر رہے ہیں ۔ یہ ذکر اس وقت کا ہے جب آپ خلیفۂ ظاہر تھے ۔ فرماتے ہیں کہ ابنِ عباس یہ جو خلافت ہے اسکی قدر میری نظر میں اتنی بھی نہیں کہ جتنی کہ اس جوتی کی ہے ۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ اس خلافت کی بکری کی ایک چھینک کے برابر بھی قیمت نہیں ہے ۔ عزیزو! میں

ایک بات تم سے پوچھتا ہوں کہ یہ خلافت جو ہے کیا یہ وہی ناموسِ کبریٰ ہے جو اللہ تعالےٰ عطا کرتا ہے، کیا کوئی آدمی جو اس رتبے کے اوپر فائز ہو تو وہ اتنی تحقیر اس رتبے کی کر سکتا ہے، کیا کوئی نبی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ میری نظروں میں اس نبوت کی قیمت حقیر ترین چیز سے زیادہ حقیر ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ یہ خلعت پہنائے تو کیا وہ اس خلعت کو اتار سکتا ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا امام حسن علیہ السلام نے اس حکومت کو جو دے دیا، تو یہ حکومت اگر خلافتِ کبریٰ ہے اور خلافتِ الٰہیہ ہے تو کیا امام حسن علیہ السلام اس رتبے کو دے سکتے تھے، ہاں اگر یہ خلافتِ الٰہیہ ہوتی تو نہ کوئی خود اسے اپنے لئے لے سکتا ہے نہ اپنی طرف سے کسی کو دے سکتا ہے، اس دنیاوی خلافت کو خلافتِ الٰہیہ اور سمجھنا بڑے مغالطہ کی بات ہے، یہ ایک غلطی جو ہوئی تو یہ ہوئی کہ جس وقت کہ لوگوں کا ہجوم ہوا مدینے میں حضرتِ عثمان کے اوپر اور ان سے یہ مطالبہ ہوا کہ آپ اس خلافت کو چھوڑ دیں تو حضرتِ عثمان نے کہا کہ جو خلعت میں پہنے ہوئے ہوں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ عزیزو! یہ بات خلافتِ الٰہیہ کے لئے تو بالکل ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اس خلعت کو پہناتا ہے تو اس پہننے والے کو اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس خلعت کو اتارے، وہ اس خلعت کو اتار نہیں سکتا، لیکن دنیاوی حکومت پر خلافتِ الٰہیہ کا قیاس کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے کسی منصب پر فائز کرتا ہے اس کی بات اور ہوتی ہے۔ رسولؐ سے یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ نبوت کا رتبہ تمھیں دیا گیا ہے تو اپنی ذمہ داری سے ہوشیار رہنا۔ رسولؐ سے تو اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ اگر ہمارے رسول پیغام کے اندر ذرا سی آمیزش کر دیتا تو ہم اس کا سیدھا ہاتھ پکڑ کر اس کے گلے کی ایک رگ کو کاٹ دیتے تو اس کے اندر گہری باتیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ معاملہ نبوت کا یہ معاملہ ہے، حق کی بات پہنچانے کا اللہ کی امانت کا معاملہ ہے، بائبل کی رو سے جو حضرتِ یونسؑ کا قصّہ بیان کیا جاتا ہے تو وہ یہی قصّہ ہے کہ حضرتِ یونسؑ کو حکم ہوا کہ تم اس قبیلے کی، اس قریئے کی ہدایت کرو، ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا بوجھ تھا، حضرتِ یونسؑ نے یہ سمجھا میں اس بارِ عظیم کو اٹھانے کا اہل نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ کا انتخاب جو ہے تو وہ حضرتِ یونسؑ کے لئے ہوا تھا، اور حضرتِ یونسؑ جو تھے

وہ اپنی معصومیت میں یہ سمجھے کہ اگر میں اس قریہ سے دُور چلا جاؤں گا تو یہ بوجھ جو ہے میرے اوپر اور یہ تکلیف جو ہے تو یہ بھی ہٹ جائے گی چنانچہ وہ ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کو پار کرنے لگے، وہاں اللہ تعالیٰ کا کرنا کچھ یوں ہوا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی ایسی باتیں کرتا ہے اور اپنے دوستوں کے ساتھ بھی ایسی باتیں کرتا ہے، تو وہاں ہوا یہ کہ دریا طوفانی ہو گیا اور لوگوں نے یہ بات کہی کہ اس میں سے کوئی نہ کوئی آدمی ہے جس کو دریا مانگ رہا ہے اور قرعہ ڈالو اور جس کے نام کا قرعہ نکل جائے اس کو دریا میں پھینک دو تو جناب یونسؑ کے نام پر قرعہ نکل آیا اور جناب یونسؑ کو دریا میں ڈال دیا گیا پھر جو کچھ بھی ہوا وہ آپ کو معلوم ہے کہ کس طریقے سے تیس دن تک آپ مچھلی کے پیٹ میں رہے اور ان تاریکیوں کے اندر آپ نے یہ بات فرمائی کہ یا اللہ بے شک تو پاک ہے اور پھر اس مچھلی نے ان کو اگلا اور پھر وہ اس بستی کے اندر گئے اور اتنے کامیاب پیغمبر ہوئے کہ خاص طور کے اوپر ہماری کتاب کے اندر یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ جب عذاب کی نشانیاں ظاہر ہو جاتی ہیں پھر توبہ کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے اور تباہ کر دی جاتی ہیں اِلَّا قَومِ یُونسؑ سوائے اس قوم کے کہ جو یونسؑ کی قوم ہے جنھوں نے توبہ کی اور اس کے بعد ہم نے ان کو اور زندگی کی مہلت دے دی تو گویا اللہ کی طرف سے جو ذمہ داری آتی ہے اس سے مفر یا گریز کا سوال نہیں۔ اچھا ایک بات میں آپ سے اور عرض کروں۔ عزیزانِ گرامی! جو امامت کی سب سے بڑی سند کہی جاتی ہے وہ حدیثِ غدیر ہے، اور اس حدیثِ غدیر کے متعلق علماء نے اتنی تحقیق کی ہے کہ اب اس کے اندر کوئی شک نہیں، یہ اور بات ہے کہ کسی کے دل کے اندر سے بدی نکلتی ہی نہ ہو۔ حدیثِ غدیر کو سب لوگ جانتے بھی تھے، اب جناب امیرالمومنینؑ کے خطبات موجود ہیں، ان کی کتابت موجود ہے، ان کے اقوال موجود ہیں اور سب سے زیادہ مستند کتاب نہج البلاغہ موجود ہے، اب نہج البلاغہ کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ اس حدیث سے استدلال نہیں کیا گیا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جناب امیرالمومنینؑ نے اس بات کو کبھی نہیں چھپایا کہ حکومت کے اوپر حق میرا ہے بلکہ اس بات کو، اپنے استحقاق کو بار بار بتاتے رہے۔ اس لئے کہ یہ حق بات تھی جس کا جتانا ضروری تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ جتنے دلائل

دوسروں کی طرف سے حکومت پر حق ثابت کرنے کے لئے پیش کئے جاتے رہے جناب امیرؑ ان کو ایک ایک کر کے رد کرتے رہے۔ جب لوگوں نے اپنے حق میں رسولؐ کی قرابت کو دلیل بنایا تو جناب امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ قرابت دار تو میں ہوں، یہ کیا ہے کہ تم ٹہنیوں کو دیکھتے ہو جڑ کو نہیں دیکھتے، پھر اگر اسلام کی خدمت ایک اصول بنا تو تم اسلام کے لئے علیؑ کی خدمت دیکھ لو، اور اگر علمِ دین ایک معیار ہے تو تم دیکھ لو کہ دین کا علم سب سے زیادہ کس کے پاس ہے، اور اگر سبقت فی الاسلام کی بات ہے تو اور لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے بعد مسلمان اسلام لائے تھے، ان کی زندگی کا ایک حصّہ اسلام کے بغیر گذرا اور علیؑ کی کیا شان ہے یہ وہ مسلمان ہے کہ جس کے متعلق یہ سوال بیکار ہے کہ وہ کب ایمان لایا اس لئے کہ اس کے متعلق کسی ایسے زمانے کا پتہ ہی نہیں کہ کب وہ مسلمان نہیں تھا۔ اگر کوئی زمانہ ایسا ہو سکتا ہے (نعوذباللہ) کہ جب محمد مصطفےٰؐ مسلمان نہیں تھے تو علیؑ بھی مسلمان نہیں تھا۔ اس لئے کہ انھیں کی گود میں آنکھ کھولی، انھیں کی تربیت میں رہے، انھیں کے ساتھ ساتھ پھرتے تھے جس طرح کہ اونٹنی کا بچّہ اپنی ماں کا اتباع کرتا ہے، روز ایک سبق دیا جاتا تھا، روز ایک درس دیتے تھے تو ان کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا ہے ہی نہیں کہ جو اسلام سے خالی ہو، پھر یہ کیسے کہا جائے کہ ان کا اسلام زندگی کے کس دور سے شروع ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کب ایمان لائے تو سوال اٹھتا ہے کہ یہ کب ایمان نہیں لائے تھے تو گویا یہ تین دلیلیں تھیں یعنی قرابت داری کی دلیل یا علمِ دین کا معاملہ یا دینِ اسلام کی خدمت کا معاملہ۔ جناب امیر المومنینؑ وہ تمام کی تمام دلیلیں جو وہ پیش کرتے رہتے تھے انھی دلیلوں پر اپنی فضیلت اور اپنا استحقاق واضح کرتے رہے، لیکن جناب امیرؑ نے یہ بات نہیں کہی کہ لوگو! غدیر کے موقع پر مجھے مولیٰ بنایا گیا تھا تم یہ بات بھول گئے۔ تمام کی تمام نہج البلاغہ تم دیکھ جاؤ یہ بات جو ہے تو یہ بات نہیں کہی گئی ہے، اس لئے کہ یہ وہ درجہ ہے امانت کا اور ولایت کا کہ جس کے متعلق کوئی تنازعہ (نہیں ہوا کرتا ہے جو تنازعہ یا کشمکش دوسری کی باتیں تھیں وہ سب کی سب موجود ہیں، لوگ دلیل دیتے

جا رہے ہیں، آپ ان دلیلوں کو رد کئے جا رہے ہیں نبوت کے سلسلہ میں یہ بات زیر بحث نہیں لائی جاتی کہ نبی میں ہوں کہ تم ہو، اسی طرح یہ نہیں ہوا کرتا کہ اس پر گفتگو ہو کہ امام میں ہوں یا تم ہو! امام تو بہر حال امام ہے اگر کوئی مانتا ہے تو اس کی سعادت ہے اور اگر نہیں مانتا تو اس سے امامت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو دلیل یعنی حدیثِ غدیر کی بات تمام کی تمام نہج البلاغہ کو آپ دیکھ لیں کہیں زیرِ بحث نہیں لائی جاتی، بڑے غور سے میں نے دیکھا کہ جناب امیر المومنینؑ نے کون کون سی دلیلیں دی ہیں تو مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ جتنی دلیلیں دوسروں کی طرف سے دی جاتی ہیں تو ان دلیلوں کا جواب دیا جا رہا ہے، ان دلیلوں کو کاٹا جا رہا ہے، لیکن حدیثِ غدیر کو نقل (Quote) نہیں کیا جاتا حالانکہ برسوں کے بعد مسجدِ کوفہ میں جب آپ لوگوں کو اپنی معرفت کرا رہے ہیں تو اس وقت اس حدیث کا حوالہ آتا ہے۔ اس وقت آپ نے پوچھا کہ اچھا تم یہ تو بتاؤ کہ تم میں سے کون کون وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے کانوں سے یہ حدیث سنی تو اس وقت بھی لوگ کھڑے ہو گئے جن کی تعداد اٹھارہ سے زیادہ بتائی جاتی ہے جنھوں نے کھڑے ہو کر یہ شہادت دی کہ ہم نے اپنے کان سے یہ بات سنی محمد مصطفیٰؐ کو غدیر کے موقع کے اوپر ہم نے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا۔

اب بات آپ یہ دیکھیں کہ معاویہ جو ہیں تو وہ قصاصِ خونِ جنابِ عثمان کا دعویٰ کرتے تھے اور جناب امیر المومنینؑ سے بیعت نہیں کرتے تھے۔ اب جناب امیر المومنینؑ اس کو خط لکھتے تو خط کے اندر جناب امیر المومنینؑ یہ نہیں لکھتے کہ میں تو مولیٰ ہوں کہ جس کو محمد مصطفیٰؐ نے مقرر کیا تھا تم یہ کیا لغو باتیں کرتے ہو، تو یہ بات نہیں کہی بلکہ یہ بات کہتے ہیں کہ حاکمِ شام! میں تو اسی طرح حاکم ہوا ہوں جیسے کہ میرے پیش رو حاکم ہوئے ہیں۔ میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے جنھوں نے ان کی بیعت کی تھی، اگر ان کی بیعت سے وہ حاکم ہو گئے تو پھر میرے حاکم ہونے میں کیا اعتراض ہے اور پھر یہ بات کہی گئی کہ جو اربابِ حل و عقد ہیں انھوں نے جب بیعت کر لی تو سب معاملہ طے ہو گیا، جو فیصلہ مدینے کے لوگوں نے کر دیا تو دوسرے لوگ اس فیصلہ کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے، اس فیصلے پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ تو یہی صورت تو میرے ساتھ ہوئی تو پھر تمھارے پاس کونسی دلیل ہے۔

اس بات کے لئے کہ تم مجھ سے پہلے خلفاء کو مانتے ہو اور مجھے نہیں مانتے تو جناب امیرالمومنینؑ معاویہ کو خط میں لکھ کر بھیجتے ہیں۔ اچھا ایک اور بات آپ دیکھیں۔ مامون نے کسی مصلحت سے کسی خاص مقصد (MOTIVE) کے تحت، جس پر میں اس وقت بحث نہیں کروں گا، جناب امام علی رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنالیا۔ اور خلیفۂ وقت یعنی مامون ایک دفعہ اتنے مہربان ہوئے کہ انھوں نے یہ بات کہی کہ میں خلافت تمھارے سپرد کرتا ہوں اس پیش کش پر جناب علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ فرماتے ہیں کہ مامون اگر یہ خلافت وہ ہے کہ باب العطایا نے (خدانے) تجھ کو دی ہے، جناب امام علیؑ ابن موسیٰ الرضا علیہ السّلام کے ارشاد کے ایک ایک لفظ کو دیکھیں، آپ فرماتے ہیں کہ اگر یہ وہ خلافت ہے کہ جو تجھ کو باب العطایا نے دی ہے اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے تو پھر تو جو خلعت اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے تو اس کو دینے کا حق تجھ کو نہیں ہے، تو اس خلعت کو اپنے جسم سے اتار نہیں سکتا، اور اگر یہ کوئی پرائی چیز ہے تو دوسرے کو دے کیسے سکتا ہے، تو نہ تو اس خلعت کو اتار سکتا ہے نہ کسی دوسرے کو دے سکتا ہے تو مجھے کیا چیز دے رہا ہے، کون سی چیز دے رہا ہے۔ یہ بات تو بالکل طے شدہ ہے کہ جو خلعت اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس کو کوئی اتار نہیں سکتا، اس کی تحقیر نہیں کر سکتا تو امام اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خلعت کی کس طرح تحقیر کر سکتا ہے، کس طریقے سے خلع خلافت ہو سکتی ہے، کس طریقے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس حکومت کی تو میری نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے، اور یہ بات یاد رہے کہ جس وقت جناب امیرالمومنینؑ حکومت قبول کر رہے تھے تو انھوں نے کہا تھا کہ میں جو کچھ حکم دوں گا تو وہ تمھیں کرنا پڑے گا، اور یہ بھی بتاتے رہے کہ اگر تم میری اطاعت کرو گے تو میں تمھیں فلاح کے راستے کے اوپر پہنچا دوں گا اور تمھیں سیدھا راستہ دکھا دوں گا اور یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا تھا کہ یہ اگر حاکم بنا، اگر علیؑ حاکم بنا تو یہ لوگوں کو سیدھے راستے کے اوپر چلائے گا۔ صراطِ مستقیم پر چلائے گا۔ عزیزانِ گرامی! ہم عقیدتاً جو بات سمجھتے ہیں تو وہ یہ بات ہے کہ بڑی بات یہی ہے، اور لوگوں کی سعادت اس بات کے اندر ہے کہ جو امام ہے تو وہی حاکم ہو، اب جس وقت کہ ہمارے امام پردہ غیبت کے اندر ہیں تو اس وقت سب سے بڑی بات جو ہے تو وہ تو یہ

ہے کہ جیسا کچھ بھی تم کر سکتے ہو اس امام کی آمد کی تیاری کے لئے جو انتظامات کر سکتے ہو وہ کرلو، جو دین کی قدریں ہیں، جو تقویٰ کی قدریں ہیں ان کو سوسائٹی میں جس قدر برتا جا سکتا ہو برتا جائے، معاشرے کو جس قدر دین کی قدروں سے ہم آہنگ کیا جا سکے اچھا ہے، یہ غیبت کا وقفہ دراصل ہماری تربیت کے لئے ہے کہ لوگ کس طرح اپنی زندگی کو دین کی قدروں سے مربوط کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو کوششیں کی جائیں، جو سوچ بچار کیا جائے، باہمی مشوروں سے جو طریقہ اختیار کیا جائے اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اس لئے کہ کلامِ پاک کے اندر بھی یہ کہا گیا ہے کہ امرھم شوریٰ بینھم یہ بھی کہا گیا ہے محمدؐ مصطفیٰ سے کہ ان سے مشورہ کرلیا کرو، ہاں اس موقع پر ایک بات میں آپ سے عرض کردوں اور وہ یہ ہے کہ اس قرآنی حکم سے جو یہ بات نکالی جاتی ہے اور اس بات کو کہا جاتا ہے کہ دین کے معاملے میں لوگوں کی رائے کی اہمیت ہے تو بس میں ایک بات دریافت کرتا ہوں کہ اس بات کا حکم جو ہے تو وہ تو محمدؐ مصطفیٰؐ کو دیا گیا ہے کہ ان سے مشورہ کرلیا کرو تو عزیزو محمدؐ مصطفیٰؐ کو کسی مشورے کی کیا ضرورت تھی، کیا یہ بات سوچنا شانِ نبوّت کے اندر گستاخی کرنا نہیں ہے بلکہ میں ایک اور بات عرض کروں کہ یہ کہنا کہ محمدؐ مصطفیٰؐ کو مشورے کی ضرورت تھی، کیا یہ نبوّت سے انکار نہیں ہے، بات یہ ہے کہ تربیت کے طریقے ہوا کرتے ہیں، بات کو سمجھانے کے طریقے ہوا کرتے ہیں، ایک مسئلہ بیان کیا جاتا ہے لوگوں کے سامنے، ان سے پوچھا جاتا ہے، کیا کہتے ہو تم اس کے متعلق، تو وہ ایک تربیت کا طریقہ ہوتا ہے۔ اور ایک سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگوں سے کام لینا ہے تو ان کے اندر شرکت کا ایک احساس (SENSE OF PARTICIPATION) ہونا چاہیئے۔ ہاں ہم بھی یہ بات کہتے ہیں محض یہ بات نہیں ہے کہ حکم آرہا ہے اور اس کو ہم مان رہے ہیں بلکہ ہم اس کے اندر پوری طرح سے شرکت (COOPERATION) کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو ایک سبق یہ بھی دیا جارہا ہے کہ وہ مل کر کوئی کام کر سکیں، آپس میں تعاون کر سکیں تو اس طریقے سے اس کے اندر اور بہت ساری مصلحتیں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ لینا کہ مشورہ کر کے کوئی ایسی بات کہہ دی جائے کہ جو رسول اللہؐ کی بات کی مخالفت ہو، جو اللہ کا رسولؐ

چاہتا ہے اس کو رد کر دیا جائے تو یہ بات جو ہے تو یہ نبوّت کو رَد کرنے والی بات ہے، ہاں
اس موقع کے اوپر ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ مشورہ کر کے جو جاننے والے ہیں جو اہلِ علم
ان سے مل کے ایک ایسا نظام کہ جو انصاف اور آزادی کا ضامن ہو، جو اسلامی قدروں پہ
قائم ہو تو اس کو تم چلاؤ لیکن تم اس بھلاوے اور مغالطے کے اندر مت رہو کہ تم اسلام
لاسکتے ہو اور اسلام پھیلا سکتے ہو، اس لئے کہ یہ مغالطہ تمھیں بہت زیادہ گمراہ کر دے گا۔
ہاں اتنی بات کرو کہ جتنی بھی نیکی ہو سکتی ہے تو ہم اتنی نیکی کرنا چاہتے ہیں جتنا بھی ہم اسلامی
قدروں کو لا سکتے ہیں تو اس کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کہنا کہ ہم اسلام کو لا رہے ہیں صحیح نہیں ہے،
اور اسلام گیا کہاں تھا جسے لا رہے ہو۔ رہا مکمل اسلام تو اسی وقت آئے گا جس وقت اُسے آنا
ہے، غیبت کے زمانے میں تو زیادہ سے زیادہ جو ہم کر سکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ اس کو نزدیک سے
نزدیک تر لائیں، کیونکہ اس وقت تو ہم کو مہمان کے استقبال کی تیاریاں کرنی ہیں اور اس سے
زیادہ اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح سے آپ یہ بات دیکھیں کہ جہاں تک کہ نظام کی بات ہے، سرمایہ داری، سوشلزم
اور کمیونزم کے جھگڑے ہیں تو اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ دینِ اسلام میں کچھ حقیقتیں ہمیں
بتادی گئی ہیں، کچھ جو بنیادی باتیں ہیں تو وہ ہمیں بتادی گئی ہیں اور پہلی پہلی بنیادی بات
یہ بتائی گئی، دیکھو یہ دنیا اور اس کی تمام نعمتیں یہ تمھارے لئے ہیں لیکن یہ دنیا مقصدِ حیات
نہیں ہے، ایک بڑا فرق بتایا گیا، تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ گنواتا ہے، وہ چیزیں کہ جو دنیا
کی زینت سمجھی جاتی ہیں اور پھر اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ دیکھو یہ متاعِ حیات ہیں مقصدِ حیات
نہیں ہیں۔ اب اگر تم اپنا کوئی اقتصادی نظام لا رہے تو اس اقتصادی نظام میں اس مرکزی
نکتہ (POINT) کو کہاں رکھو گے؟ کسی نظام میں ایسی بات کی گنجائش کہاں ہے؟
نظام میں تو سیدھی سیدھی باتوں کو آپ پیش کریں کہ اس طرح سے عمل کریں اور دین جو ہے
تو وہ قلب تک سرایت کرتا ہے۔ دین کا بیج دل میں بویا جاتا ہے، تو اب اس طریقے سے
پہلی بات یہ بتائی گئی کہ دنیا اور اس کی چیزیں تمھارے لئے ضروری ہیں۔ زندگی کا قیام
ان پر منحصر ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں لیکن یہ مقصدِ حیات نہیں ہیں متاعِ حیات ہیں۔

کہیں تم ان کو مقصدِ حیات نہ سمجھ لینا۔ اب اس نکتہ کی روشنی میں تم مختلف اقتصادی نظاموں کا جائزہ لو، ان پر غور کرو، وہ سوشلزم ہو یا کیپٹل ازم یہ انسانوں کے اقتصادی مسائل کو اپنے علم کی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اقتصادیات کا مطالبہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اقتصادیات کی بنیاد یہ ہے کہ آدمی کی ضروریات لامحدود ہوتی ہیں اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے جو وسائل ہیں تو وہ بہت محدود ہوتے ہیں اب تمام کا تمام فن اور تمام کا تمام علم اقتصادیات کا اس میں ہے کہ ان لامحدود ضروریات کو ان محدود وسائل سے کس طرح سے مطابق (ADJUST) کیا جائے۔ اس کے برعکس دین کی بات یہ ہے کہ انسان کی ضرورتیں محدود ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خزانے لامحدود ہیں، گویا اقتصادیات کے نظاموں اور دینِ اسلام کی فکر دونوں شقوں کے بارے میں بالکل تضاد ہے، ماہرِ اقتصادیات کہتا ہے کہ انسان کی احتیاجات (WANTS) لامحدود ہیں۔ اللہ کے نزدیک تمھیں زندہ رہنے کے لئے بہت زیادہ چیزوں کی ضرورت نہیں۔ تمھاری احتیاجات محدود ہیں۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے خزانے لامحدود ہیں۔ جبکہ ماہر اقتصادیات کے نزدیک احتیاجات لامحدود ہیں اور ان احتیاجات کی تسکین کے وسائل (MEANS OF SATISFACTION) محدود ہیں تو اس طرح اقتصادی نظاموں اور دین کے درمیان بنیاد ہی میں اختلاف ہے۔ دین کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ کے خزانوں میں تو کبھی کمی نہیں آسکتی، اللہ تعالیٰ کے خزانے تو لامحدود ہیں بشرطیکہ تم ضروریات کو سمجھو اور اللہ کا رسولؐ یہ بات کہتا ہے کہ ایمان کا نصف حصّہ تو یہ ہے کہ انسان اپنی ضروریات کی حد مقرر کرے، جس نے اپنی ضروریات کی حد مقرر کی تو اس نے تو گویا ایمان کا نصف حصہ جو ہے تو وہ بھی پورا نہیں کیا۔

جہاں تک مال و دولت کا تعلق ہے تو ہمیں مال حاصل کرنے اور مال خرچ کرنے دونوں کے متعلق ہدایت کی گئی ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ مال کو حلال طریقے سے حاصل کرو اور اس کو خرچ کرو اللہ کے راستے میں۔ اس کو جمع کر کے کبھی مت رکھنا، اور تم مت یہ سمجھنا کہ یہ مال تمھارا ہے اس لئے کہ یہ مال جو ہے تو تمھارے پاس امانت ہے، اس کے متعلق میں آپ کو دو ایک حوالے کلامِ پاک سے دکھاؤں، جب جنابِ شعیبؑ نے اپنی قوم والوں سے کہا انفاقِ مال کے متعلق

تو قوم والے کہنے لگے، شعیب یہ تیری نماز ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں کہ جو ہمارے بزرگ پوجتے چلے آئے ہیں تو کیا تیری نماز یہ بھی حکم دیتی ہے کہ جو کچھ مال ہم نے کمایا ہے اپنی ترکیب سے، اپنی ہوشیاری سے، تو اس کو جیسے چاہیں استعمال نہیں کر سکتے، کیا یہ بھی تیری صلوٰۃ (نماز) کا حکم ہے، گویا وہ بات سمجھتے تھے کہ چونکہ مال ہم نے کمایا ہے تو اس لئے جس طریقے سے بھی ہم چاہیں تو اس کو خرچ کریں، قارون نے یہ بات کہی کہ یہ مال جو میں نے کمایا میں نے اپنے علم سے حاصل کیا ہے اس لئے میں جس طرح سے چاہوں خرچ کروں۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو چیز تم کو دی گئی ہے، اس مال کے لئے کہتا ہے کہ جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ امانت ہے، اللہ تعالیٰ زراعت کی چھوٹی سی مثال بیان کرتا ہے کہ اور تم ان کھیتوں کو تو دیکھو ان کو تم بڑا کرتے ہو یا میں بڑا کرتا ہوں تو جو بات بھی چلے گی جس قسم کی بھی ہو گی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں ہی سے چلے گی تو اللہ تعالیٰ اس بات کو ہم سے کہتا ہے اور اس بات کو میں اور مختصر کروں، اللہ تعالیٰ ایک جگہ ہم سے اس بات کو کہتا ہے کہ جو کچھ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے۔ اسمیں جو تمہارا حصہ ہے جو محنت کا حصہ ہے اس کو مت بھولو مگر یہ بات سمجھتے رہو کہ تمہاری عقل اس کی دی ہوئی ہے، تمہارا علم بھی اس کا ہے جو قدرتی ذرائع ہیں تو وہ بھی اسکے ہیں کہ جن کے بغیر کوئی پیداوار نہیں ہو سکتی تو اس کو تم مت بھولو کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہے تو اس طریقے سے تم دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور دنیا کے اندر فساد مت پھیلاؤ، یہ جو تمہارا مال و دولت جمع کرنا ہے تو یہ فساد پھیلانا ہے تو اکتناز زر کے ذریعے فساد مت پھیلاؤ، تو یہ چند باتیں جو ہیں تو تمہارا نظام جو کچھ بھی ہے اس نظام کے اندر ان قدروں کو رائج کرو، جہاں تک بھی رائج کر سکتے ہو، جہانتک بھی یہ بات آگے چلے گی تو تم اسلام سے نزدیک تر ہوتے چلے جاؤ گے۔

ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ اسلام جس کو کہتے ہیں اور مکمل اسلام جو ہے تو اس کے لئے ایک شخص کی ضرورت ہے، وہ کتاب کے اندر اپنی

(THEORIES) نکالنے سے نہیں ہوا کرتا مکمل اسلام ایک شخص کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے اور مکمل اسلام اور ایک بولتا ہوا قرآن ایک شخص ہی ہوسکتا ہے، فرق جو ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے دوسرے فرقوں کے اندر کتاب کے اوپر بہت زور دیا جاتا ہے بلکہ یہ بات کہی جاتی ہے کہ بس کتاب ہمارے لئے کافی ہے ہم یہ بات کہتے ہیں کہ اگر تمھیں اس کتاب کی طرف بھی دیکھنا ہے تو تم اس شخص کو دیکھو جو بولتا ہوا قرآن ہے ہم دونوں باتوں کو یعنی کتاب کو اور وارثِ کتاب کو برابر سمجھتے ہیں تو فرق جو ہے تو وہ اتنا ہے کہ ہم شخص کو بھی ضروری سمجھتے ہیں بلکہ زیادہ ضروری سمجھتے ہیں اس لئے کہ بغیر اس کے کتاب جو ہے تو وہ گونگی ہو جاتی ہے۔

اور شخص کی صورت میں کس کس موقع پر اسلام آیا اور کس کس شان سے اسلام آیا، تم یہ تو دیکھو کہ کربلا میں کس شان سے اسلام آیا، یہ مظلومیت کی شان کیسی دھوم دھڑکے سے یا فتح کے شادیانے بجاتا ہوا اسلام نہیں آیا، اب یہ میدانِ کربلا کے اندر جو اسلام آیا ہے تو یہ مظلومیت کی شان میں آیا ہے، لیکن اللہ اکبر اس مظلومیت میں اس کی فعالیت کو دیکھو، اس کی کشش تو تم دیکھو کہ تمام کے تمام انبیاء کا ورثہ سمٹ کر ایک شخص کے اندر آگیا ہے۔ یہ تمام کے تمام انبیاء کے ورثے کی بات جو ہے تو اس کو تم اس طرح دیکھو کہ وہ کعبہ کہ جس کو تعمیر کیا جناب ابراہیمؑ نے اور جس کے لئے کہ آپ کا امتحان ہوا، جس کے لئے جنابِ اسماعیلؑ ذبیح اللہ ہوئے، اب یہ فخرِ ذبیح اللہ آیا ہے اس لئے کہ کعبہ کی بنیادیں متزلزل ہو رہی ہیں، کعبہ کی ان بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے اب فخرِ ذبیح جو ہے وہ آیا ہے اور ابوالبشر اس منظر کو دیکھیں کہ خیر البشر کا ٹکڑا آخر کس منزل کے اوپر ہے اور انسانیت کی ممکنات کو اس نے کس حد تک بڑھا دیا ہے۔ پھر یہ جناب عیسیٰؑ جو ایک مردے میں جان ڈال دیتے تھے یہ دیکھیں کہ کس طریقے سے ایک دین کے اندر جان ڈالی جاتی ہے، اور مردہ قوم کے اندر جان ڈالی جاتی ہے کہ تو یہ حسینؑ وارثِ انبیاء ہے۔ یہ انبیاء کی تعلیمات اور صفات کا وارث ہے اور پھر جو آدمی اس کے ساتھ ہیں وہ خود اس کا ایک حصہ

بن چکے ہیں، گویا کہ اس جہاد میں حبیب ابنِ مظاہر شہید ہو رہے ہوں یا مسلم بن عوسجہ شہید ہو رہے ہوں، جناب علی اکبرؑ کے کلیجے میں برچھی لگ رہی ہو یا جناب علی اصغرؑ کے گلے میں تیر لگ رہا ہو تو تم یہ سمجھو کہ حسینؑ جو ہے تو وہ قطع کیا جا رہا ہے، حسینؑ جو ہے تو وہ شہید کیا جا رہا ہے، کبھی اس کا ہاتھ کٹ جاتا ہے کبھی اس کے کلیجے پر برچھی آ کر لگتی ہے لیکن تم یہ بھی دیکھو کہ جیسے جیسے یہ بات ہوتی چلی جا رہی ہے، دین جو ہے تو وہ اور مسلّم ہوتا چلا جا رہا ہے اس لئے کہ جس طریقے سے کہ امام حسینؑ حیاتِ جاوداں کے مالک ہیں تو یہ دین بھی ہمیشہ کے لئے قائم ہے، وہ امام حسینؑ کا ایک ایک عضو جو ہے تو وہ قطع کیا جا رہا ہے اور چند ساعت تک یہی بات ہوتی رہی، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ یہ چھوٹا سا واقعہ ایک بیابان کے اندر جو ہوا ہے ایک بہت بڑی سلطنت کے اندر ہو رہا ہے، اس کی اہمیت اتنی ہے کہ آج اللہ اور ملائکہ سبھی اسی طرف دیکھ رہے ہیں، اسی واقعہ کی طرف دیکھ رہے ہیں، اس وجہ سے کہ اس واقعہ کی فتح و شکست جو ہے اس کے اندر تو تمام وراثتِ انبیاء کا سوال ہے کہ وراثتِ انبیاء جو ہے وہ قائم رہتی ہے یا وراثتِ انبیاء ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے، اگر ذرا آج یہ شخص کہ جو اسلام مجسم ہے، اگر نعوذ باللہ بیعت کر لیتا ہے۔ باطل کے آگے جھک جاتا ہے تو اسلام بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بیعت کے انکار کے اوپر رکا ہوا ہے اور صبر و استقلال کے ساتھ ہر بات کا مقابلہ کر رہا ہے تو وراثتِ انبیاء جو ہے تو وہ بھی سلامت رہتی ہے تو اللہ اور اس کے ملائکہ اسی میدان کی طرف اسی واقعہ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہاں ایک بات میں عرض کروں کہ محمدؐ رسول اللہ کا دل بڑا خون ہو رہا ہوگا، خون کے آنسو نکل رہے ہوں گے اس لئے کہ محمدؐ مصطفٰے کا یہ ایک پارۂ جگر ہے، اس کا ایک حصہ ہے لیکن ہاں جہاں خون کے آنسو ہیں اور جہاں دل خون ہو رہا ہے تو وہاں اتنی بات ہم سمجھتے ہیں کہ محمدؐ مصطفٰے کو عجیب قسم کا اطمینان بھی ہو رہا ہوگا کہ اسلام کی قدریں جو ہیں وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو رہی ہیں اور ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ فخر بھی محسوس ہو رہا ہوگا کہ یہ میرا پارۂ جگر جو ہے اس کی یہ شان ہے۔

آٹھویں مجلس

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جو بہت یکتا ہے، جو یکتا ہے اپنی ذات میں، جو یکتا ہے اپنی صفات میں، جو یکتا ہے اپنے افعال میں، جس نے اس کی ذات کو یا اپنی صفات کو یا اس کے افعال کو کسی اور چیز کے اوپر قیاس کیا اس نے الحاد کیا، اس کی صفات عینِ ذات ہیں، اس کو عالم اور قادر ہونے کے لئے علم اور قدرت کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے، وہ صَمَد ہے، ملک اسی کا ہے جس کی وہ ہدایت کرے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، ہے اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے اس کی کوئی ہدایت نہیں کر سکتا، اور میں درود بھیجتا ہوں محمد مصطفٰےؐ پر جو کافۃ الناس کی ہدایت کے لئے اللہ کی رحمت بن کر آئے اور اللہ کا رسولؐ جس نے بندوں کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے جوڑ دیا جس نے اس زوال و فنا کی گھاٹی میں جس کو دنیا کہتے ہیں ایمان اور عملِ صالح کا راستہ دکھا کر انسان کو موت سے زندگی کی طرف نکال لیا، ظلمت سے نور کی طرف نکال لیا، اور میرا سلام ہو ان پر جنھوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا وہ کہ جو ایمان لائے اللہ پر اس کے ملائکہ پر اس کی کتابوں پر اور جو کچھ کہ اس نے نازل کیا اس کے نبیوں کے اوپر اور وہ کہ جو اللہ کی محبت کے اندر اپنا مال خرچ کرتے ہیں ذوی القربیٰ پر اور یتیموں پر، مساکین پر، پردیسیوں پر، مجبوروں پر اور اسیروں پر اور وہ جو قیامِ صلٰوۃ کرتے ہیں۔ جن کی نماز کے اندر بڑا خشوع ہوتا ہے اور جو نماز کی حفاظت اور نگہداری کرتے ہیں، اور مومنوں کے لئے کہا گیا ہے کہ جب وہ عہد کرتے ہیں تو اس عہد کو پورا کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے عہد ہو، وہ رسولؐ سے عہد ہو یا وہ انسانوں سے عہد ہو۔ جو عہد وہ کرتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں اور یہ تنگی میں اور سختی میں اور کڑی مصیبتوں میں صبر و استقلال سے کام لیتے ہیں، صبر و صلٰوۃ سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہی لوگ سچے ہیں، وہی صادقون ہیں، وہی لوگ متقی ہیں، انھیں کے اوپر اللہ کی رحمتیں ہیں،

ہمارا اسلام ہو اور خدا کی سلامتی ہو ان لوگوں کے اوپر کہ جنھوں نے ہدایت کی پیروی کی، ہدایت پر عمل کیا۔

عزیزانِ گرامی! کل کی تقریر میں کچھ یہ بتا رہا تھا کہ کس طرح سے دنیا کے اندر سیاسی اور معاشی نظام بدلتے رہتے ہیں اور اسلام کی کسی ایک نظام کے ساتھ تطبیق کرنا کتنی الجھنوں کے اندر آدمی کو ڈال دیتا ہے، میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ اسلام تو ایک حقیقت ہے زندگی کی، ایک روح ہے اور نظام جو ہے تو وہ ایک FORMATI . ایک فریم ورک FRAME WORK ہے، ایک حاشیہ ہے تو اسلام کو کسی ایسے حاشیے یا فریم ورک کے ساتھ تطبیق دینا اور اس کو کسی نظام کے ساتھ چسپاں کرنا تو اس سے عجیب طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور یہ ایک قرآنی اصول میں نے آپ کے سامنے عرض کیا کہ بہترین صورت معاشرے کی وہ ہے کہ ملک اور حکمت ایک جگہ جمع ہوں، آپ ایک بات غور فرمائیں اور وہ یہ کہ یہ دو صفات جو ہیں علم اور قدرت ان کو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ذاتی کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لئے جب صفات استعمال کی جاتی ہیں تو ان کا مطلب عام مطلب سے مختلف ہوتا ہے۔ جیسے وجود کی بات ہے تو اللہ تعالیٰ کا وجود دوسرے وجود سے بالکل مختلف ہے، اختلاف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی وہ ہے کہ جس کی کوئی ضد نہیں، جس کے لئے نیستی نہیں اور اللہ تعالیٰ وجود اور عدم دونوں کا پیدا کرنے والا ہے، اس نے وجود بھی پیدا کیا اس نے عدم بھی پیدا کیا، اس نے زندگی بھی پیدا کی اس نے موت بھی پیدا کی تو دو یہ صفات علم اور قدرت یہ اس کی صفاتِ ذاتی ہیں، علم کا تعلق حکمت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی علیم کی صفت سے ہے اور ملک کا تعلق اللہ تعالیٰ کی قدرت کی صفت سے ہے، یہ دونوں کی دونوں چیزیں جمع ہوں تو یہ سب سے بہتر صورت معاشرے کی ہوا کرتی ہے، اب ایک بات اور جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام کے تمام فریم ورک (FRAME WORK) یہ تمام کے تمام ڈھانچے یہ سیاسی نظام اور یہ اقتصادی نظام یہ سب بذاتہٖ تو مقصد نہیں ہیں یہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں تو عزیزانِ گرامی پہلی بات تو یہ طے کرنی ہے کہ زندگی کا کیا نمونہ ہمارے سامنے ہے، ہماری زندگی کے اندر قدرِ اعلیٰ کیا ہے؟ جب یہ بات

طے ہو جائے یہ علتِ غائی طے ہو جائے تو پھر ان باتوں کو دیکھا جا سکتا ہے کہ سیاسی ڈھانچہ کیا ہونا چاہیئے اور اقتصادی ڈھانچہ کیا ہونا چاہیئے، مگر سب سے پہلے تعلیم جو دی ہے وہ حیاتِ طیبّہ کی ہے، حیاتِ طیبہ کو ہم اپنے سمجھنے کے لئے اچھی زندگی یا گُڈ زندگی یا GOOD LIFE کہہ سکتے ہیں حالانکہ حیاتِ طیبّہ کا مفہوم GOOD LIFE کے مفہوم سے بہت وسیع ہے، اب تم ایک بات دیکھو کہ اگر GOOD LIFE کا تمھارا تخیّل یا حیاتِ طیبّہ کا تمھارا تخیّل ایسا ہے کہ اس کے اندر کوئی فساد ہے تو پھر اس کے لئے تم کتنے ہی ڈھانچے تیار کئے جاؤ تو اُن سے کوئی مقصد تو حاصل نہیں ہو سکتا ہے، اب میں تھوڑی سی بات کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں اور وہ یہ ہے کہ ہم نے ملکوں کی اور معاشروں کی تقسیم کر رکھی ہے کہ یہ ترقی کا تصوّر یہ بھی ضمناً میں عرض کروں کہ یہ بھی انسانی تاریخ کے اندر، زمانے کی تاریخ کے اندر بہت نیا ہے تو صورت یہ ہوئی کہ مختلف ملکوں اور معاشروں میں درجہ بندی ہے، ایک ملک جو ہے تو وہ بہت ترقی یافتہ ہے اور دوسرا جو ہے ترقی پذیر ہے، یہ اس راستے پر چل رہا ہے کہ جو راستہ ترقی یافتہ ملک کا ہے گویا زندگی کا جو نمونہ ہمارے سامنے ہے تو یہ وہ نمونہ ہے کہ جو ترقی یافتہ ملکوں کے اندر ہے، اس لئے کہ وہ اس منزل کے اوپر ہیں، ہم اس منزل کی طرف چل رہے ہیں یا ایک ہی راستہ ہے، اس راستے کے اوپر وہ ہم سے آگے ہیں ہم ان سے پیچھے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ کسی طرح سے ہم اس نکتہ تک پہنچ جائیں یا اس منزل تک پہنچ جائیں جس پر ترقی یافتہ قوم ہے۔ تو اب اگر دماغ کے اندر یہ بات ہے کہ زندگی کا نمونہ تمھارا وہی ہے اور اس میں ذرا سا عیاشیت کی حد نکال کے اس میں تھوڑا سا اسلام کا جوڑ لگا دیا جائے تو وہ تمھارے لئے حیاتِ طیبّہ کا نمونہ بن گیا وہ گویا کہ تمھارے لئے GOOD LIFE کا تو ایک بات بڑے عجز کے ساتھ میں آپ کے ساتھ میں آپ سے عرض کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس طرح تو کلامِ پاک سے کچھ زیادہ ہدایت نہیں مل سکتی، یہ دوسری بات ہے کہ تم کلامِ پاک سے کھیل کھیلے جاؤ مگر ہدایت کی بات نہیں ہو سکتی، وہ اس وجہ سے کہ دونوں معیار مختلف ہیں، حیاتِ طیبّہ کا کلامِ پاک میں جو تصور ہے وہ تو زندگی کی ایک کیفیت کا نام ہے اور تمھارا جو GOOD LIFE

کا تخیل ہے، وہ ایک کمیت لئے ہوئے ہوئے ہے اس لئے quantity کیفیت
اور QUANTITY کمیت کا فرق ہے، تمھارا جو (GOOD LIFE) کا تخیل ہے تو
اس کے اندر تو چیزوں کی بہتات ہے، آرام ہے، عیش ہے، یہ تمام کی تمام باتیں ہیں، مگر
کلامِ پاک میں حیاتِ طیبہ کی یہ تعریف نہیں، تم کمیت کا آلہ لئے ہو، تم کمیت کی مقدار کی
کی ترازو لئے ہوئے ہو اور ادھر دوسرا آلہ ہے، ادھر فرقان جو ہے
کلامِ پاک کی جو منزل ہے وہ کیفیت ( ) کی ہے، زندگی کی کیفیت کی
ہے کہ یہ زندگی کس قسم کی ہے، کتنی اس کے اندر گہرائی ہے، کیا اس کے اندر مقاصد ہیں، یہ
آدمی کیسا ہے، اس کا اللہ سے تعلق کیسا ہے، کلامِ پاک کا جو پیمانہ ہے اور کلامِ پاک کا جو میزانیہ
ہے تو وہ تمام تر کیفیت ( ) کے اوپر زندگی کی حالت کے اوپر منحصر ہے
تمھارا حیاتِ طیبہ کا تخیل GOOD LIFE کا تخیل اور تصور وہ تمام کثرت کے
اوپر اور مقدار کے اوپر ہے تو ظاہر ہے اس طرح سے ( ) کمیت کے ذریعے
سے ( ) کیفیت نہیں پیدا کی جا سکتی، سب سے بڑا فساد اس بات کا ہے
کہ ہم نے ابھی یہ بات طے نہیں کی کہ ہم کیسی زندگی چاہتے ہیں، ہمارے معاشرے کے اندر اعلیٰ
قدریں کونسی ہیں اور جب منزل طے نہیں ہوتی تو ظاہر ہے کہ راستے کے ملنے نہ ملنے کا سوال
ہی نہیں پیدا ہوتا، پہلے تو منزل طے ہوتی ہے، پہلے تو علتِ غائی طے ہوتی ہے یہ تو فیصلہ
کریں کہ ہم چاہتے کیا ہیں، اور کس قسم کی زندگی ہم چاہتے ہیں اور یہ بات کہ ہم کون سی زندگی
چاہتے ہیں تو یہ بات تو اسی سے معلوم ہو جاتی ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جو زندگی کی آسائشیں
ہیں، یہ جو عیش و عشرت ہے، یہ جو تمام کی تمام ترقی کی باتیں ہیں تو اسلام ان سے منع تھوڑا
ہی کرتا ہے، مگر یہ اپنے نفس کو دھوکہ دینا ہے۔ کبھی اسلام تو حلال و حرام چیزوں سے منع
کرتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام زندگی کا کیسا تصور پیش کرتا ہے، مقصد کیا پیش کرتا ہے،
حیاتِ طیبہ کس کو کہتا ہے، اکثر طالب علموں کو بنانے میں اور ان کی ہدایت کرنے میں بڑی
دشواری آجاتی ہے اس لئے کہ ایک راستہ تو ترکستان کی طرف جاتا ہے اور ایک راستہ
کعبہ کی طرف جاتا ہے، کبھی تو ان کے سامنے نمونہ جو ہے تو وہ ترقی یافتہ ملک کا رکھا جا۔

ہے کہ تمھارے ملک کو جلدی سے جلدی ادھر کی طرف پہنچنا ہے اور پھر بتایا یہ جاتا ہے کہ نمونے جو اپنے سامنے رکھو تو وہ محمدؐ کے نمونے رکھو، وہ علیؑ کے نمونے رکھو، اب جناب لوگ جو ہیں تو وہ حیران ہوتے ہیں اس تصویر کو دیکھیں یا اس تصویر کو دیکھیں، اس ملک کے معاشرے کو دیکھیں کہ جس جگہ تمام کی تمام طاقت جو ہے، دولت جو ہے مقدار سے ناپی جاتی ہے یا اس کی طرف دیکھیں جو یہ بات کہتا تھا کہ میرا فقر میرے لئے باعثِ فخر ہے۔

تو یہ بات تمام کی تمام (CONFUSION) الجھنیں پیدا کرنے والی ہے کہ ہم نے ابھی یہ نہیں سوچا کہ ہم واقعی اپنی زندگی میں چاہتے کیا ہیں، زندگی کے اندر کون سی قدر، قدرِ اعلیٰ ہو، ہماری منزل کیا ہے جب یہ طے ہو جائے تو پھر اس منزل تک پہنچنے کے لئے راستے تلاش کئے جائیں، اس کے ذرائع تلاش کئے جائیں، جب تک یہ بات نہیں ہوتی تو اس وقت تک عزیز دیہ سب کا سب اپنے نفس کو دھوکا دینا ہے اس کے علاوہ اور دوسری بات نہیں ہے۔

گذشتہ تقریر میں اسلام کے معاشی نظام نہیں بلکہ اسلام نے جو اصول معاشی معاملات کیلئے دیئے ان کے متعلق کچھ عرض کر رہا تھا اور وہ واقعی بہت ضروری بات تھی، اس لئے کہ جہاں تک کہ زندگی کے تعلقات کا ذکر ہے تو اس کے اندر یہی معاشی اور اقتصادی تعلقات چلتے ہیں، اس سلسلے میں پہلا اصول یہ ہے کہ یہ تمام کی تمام زندگی کی چیزیں یہ سب متاعِ حیات ہیں یہ مقصدِ حیات نہیں ہیں، اسی ایک اصول کی روشنی میں ترقی یافتہ معاشروں کے معیارِ حیات اور اسلام کے تعلیم کئے ہوئے معیار کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ تمھارے باپ دادا اور یہ تمھارے گھربار، یہ تمھارے قبیلے اور یہ تمھارے اخوان اور بھائی اور یہ تمھارا مال کہ جو تم نے جمع کیا ہے اور یہ تمھاری تجارتیں کہ جس کے اندر تمھیں نقصان کا اندیشہ رہتا ہے اور یہ تمھارے مکان کہ جن کو تم دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہو، اگر یہ تمھیں اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ عزیز ہیں تو تم انھیں لئے بیٹھے رہو اور انتظار کرتے رہو، اللہ تعالیٰ فاسقوں کی ہدایت نہیں کرتا، یعنی سب سے زیادہ گہری محبت اللہ کے لئے ہو اور اگر دنیاوی چیزوں سے

محبت محض اللہ کے لئے نہ ہو تو اس کو کلامِ پاک فسق کہتا ہے اور اللہ تعالیٰ فاسقوں کی ہدایت نہیں کرتا، پھر اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ یہ تمہاری خواہشات اور تمہاری شہوات ان کی محبت تمہاری آنکھوں میں زینت پا گئی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اور یہ بات کہتا ہے اور پھر تمہاری جو عورتوں سے محبت ہے یہ بچوں سے محبت، یہ تمہارے سونے چاندی کے ڈھیر جو تم نے جمع کر رکھے ہیں، یہ تمہارے شاندار گھوڑے (گھوڑے اس زمانے میں بڑی قدرت و بڑی شان کا مظہر ہوتے تھے) اور یہ تمہارے چوپائے (کہ جو صورت اس زمانے میں مال و دولت کی تھی) اور یہ تمہاری کھیتیاں تو ان کی محبت تمہارے دماغوں میں تمہارے دلوں کے اندر رچ بس گئی ہے اور زینت پا گئی ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ چیزیں تو متاعِ حیات ہیں، یہ چیزیں مقصدِ حیات نہیں ہیں، مقصدِ حیات تو یہ ہے کہ سب سے بہتر خزانہ تو اللہ کے پاس ہے، سب سے بہتر انعام تو اللہ کے پاس ہے، ایک طرف تو تم یہ دیکھو کہ کسبِ حلال کو اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی تلاش ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی تلاش ہے اور دوسری طرف دنیا کی مذمت بھی کلامِ پاک کے اندر آگئی کہ یہ بھی بتایا گیا کہ یہ دنیا متاعِ غرور ہے، دھوکے کی پونجی ہے، تو گویا اب یہ بات ہمیں معلوم ہو گئی۔ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ایک ذریعہ بنتی ہیں تو بالکل ٹھیک ہے، اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں تو ان سے زیادہ ذلیل اور ان سے زیادہ کمینی کوئی چیز نہیں ہے اس لئے کہ اس رخ سے دنیا کے معنی ہی کمینی کے ہیں تو گویا پہلا ہی پہلا اصول جو ہے وہ گویا اللہ نے اور اس کی کتاب نے ہمیں یہ بات بتائی، اور دوسرا اصول اس سلسلے میں ہمیں یہ بتایا گیا۔ یہ تمام چیزیں جو تمہارے پاس ہیں تو وہ تمہارے پاس ایک امانت کے طور کے اوپر ہیں، یہ مال تمہیں اللہ نے دیا ہے اور اس قسم کا خیال کرنا کہ یہ تمہارے علم کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ قارون کا فلسفہ ہے، اس لئے کہ قارون نے یہ بات کہی کہ یہ تمام کا تمام مال جو آیا ہے یہ تو علم کی وجہ سے آیا ہے اور یہ بات کہ اس مال میں جیسا تم چاہو اپنی مرضی سے تصرف کرو، تو یہ قومِ شعیب کا کہنا ہے جو یہ بات کہتے تھے کہ یہ مال ہم نے کمایا ہے جیسا اس میں چاہیں تصرف کریں۔

اے شعیبؑ یہ تیری نماز کیسی ہے جو ہمیں ہی ہمارے ہی مال میں تصرّف کرنے سے روکتی ہے اور کلامِ پاک کے اندر جس جگہ مال کا ذکر آیا ہے تو وہ یہ آیا ہے کہ یہ مال تمھیں اللہ نے دیا ہے ، سب سے بڑی بات ہی یہ ہے کہ عبدیت کی شان یہ ہے ، عبد کی کوئی چیز اپنی نہیں ہوتی جو کچھ ہوتا ہے اس کے آقا کا ہوتا ہے اور عبد کے پاس امانت کے طور ہوتا ہے اور اب عبد کا فرض یہ ہے کہ اس امانت کو اپنے آقا کے حکم سے استعمال کرے اور پھر یہ بات بتائی گئی کہ اور جو کچھ تمھیں اللہ نے دیا ہے اس کے ذریعے سے تم دارِ آخرت کو تلاش کرو اور دنیا میں اپنا حصّہ مت بھولو ۔

عزیزانِ گرامی ! یہ دنیا کا معاملہ جو ہے تو یہ بڑا پیچیدہ معاملہ ہے اس لئے کہ دنیا کی مذمتیں بھی بہت آئی ہیں لیکن یہ اصل میں دنیا کو غلط سمجھنے کی بات ہے ، جب دنیا کو غلط سمجھا جائے تو یہ قابلِ مذمت ہے ، لیکن اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز باطل نہیں پیدا کی ہے ہر چیز حق کے ساتھ پیدا کی ہے ، آپ کے چاروں طرف جو کچھ بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور خود آپ کی عقل آپ کا ہنر وہ سب اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہے اس کے غلط استعمال سے ان تمام باتوں کی ، جو اللہ کی نعمتیں ہیں حیثیت ہی بدل جاتی ہے ، اور پھر ہم اللہ تعالیٰ کے غضب کے سزاوار ہوتے ہیں ، اب دوسرے رُخ سے دیکھئے تو میں آپ سے عرض کروں اسی دنیا کے متعلق جناب امیرالمومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے ، اور یہ ارشاد اس شخص کا ہے جو یہ بات بارہا کہہ چکا ہے کہ اے دنیا کسی اور کو اپنے دھو کے میں ڈال جس نے یہ بات کہی کہ میں اس دنیا کو طلاق دے چکا ہوں اب یہ دنیا میرے پاس لاکھ بن بن کے آئے وہ مجھے بہکا نہیں سکتی ، ابوطالبؑ کے بیٹے کو یہ دنیا بہکا نہیں سکتی ، یہ کتنی ہی زینت سے بن بن کے میرے پاس آئے ، اس لئے کہ میں اس کو طلاق دے چکا ہوں ۔ اب وہ دنیا کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ جو دنیا کا صحیح مقام پہچان گیا اس کے لئے یہ دنیا دارالصدق ہے ، دارالصدق ہے ، گویا غلطی کیا ہے غلطی یہ ہے کہ آپ اس کا صحیح مقام نہیں جانتے ، آپ نے اس کو اپنا خدا بنا لیا ، آپ نے اس کی پرستش کرنا شروع کر دی لیکن جو اس کا صحیح مقام جان گیا اس کے لئے یہ دنیا دارالصدق ہے اور فرماتے ہیں کہ

جو اسے سمجھ گیا اس کی زینت کو اس کے دھوکوں کو جو اس کو سمجھ گیا اس کے لئے یہ دنیا دارِ عافیت ہے۔ پھر جنابؑ کا ارشاد ہے کہ جو اس دنیا سے زادِ راہ لینا چاہے اپنی اس زندگی کے سفر کے لئے، اپنی عاقبت کے لئے تو اس دنیا کے اندر بہت دولت موجود ہے۔

عزیزانِ گرامی! اسی دنیا کے استعمال سے تو آخرت کا بننا یا بگڑنا ہے، یہ دنیا دارالامتحان ہے، اسی کے بعد تو دارِ عاقبت ہے، تو آپ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنا توشہ لینا چاہے آخرت کے لئے اور زادِ راہ لینا چاہے تو اس کے لئے یہ دنیا بڑی مال، بڑی دولت کی جگہ ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اور جو شخص عبرت حاصل کرنا چاہے اس کے لئے یہ دنیا دارِ موعظت ہے، اس کے اندر تو قدم قدم پر وعظ و پند ہے، اس کے اندر نصیحت ہے، اس کے اندر حکمت ہے، اس کو سمجھنے سے آدمی کو حکمت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے عقل کو جلا ہوتی ہے، انسان نصیحت حاصل کرتا ہے، عبرت حاصل کرتا ہے اور پھر آپ فرماتے ہیں کہ یہ دنیا، یہ دنیا تو اللہ کے دوستوں کی مسجد ہے، یہ دنیا یہ دنیا تو فرشتوں کا مصلیٰ ہے، یہ دنیا وہ ہے کہ جس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی وحی نازل ہوتی ہے وحی کا مہبط ہے اور پھر آپ فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ، اولیاء اللہ کے لئے تو یہ تجارت گاہ ہے اور وہ تجارت گاہ کیا ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور اس کے فضل کا سودا کرتے ہیں اور جنت کو خریدتے ہیں۔ اسی دنیا کے اندر تو، گویا جناب امیر المومنینؑ نے اسی دنیا کے متعلق یہ ارشاد فرمایا، جو بات نظر میں رکھنی ہے وہ ہے کہ دنیا میں جو تمھارا حصّہ ہے اس کو بھولو مت، دنیا کو صحیح استعمال کرو، دنیا سے عبرت حاصل کرو، دنیا سے حکمت حاصل کرو، دنیا کے اندر تجارت کرو اپنے اللہ سے اس کے فضل اور رحمت کی تجارت کرو تو تمھیں قیمت کے اندر جنت ملے گی، دنیا سے اپنا زادِ راہ لو، اس دنیا کو دیکھو غور کرو تو دنیا میں اپنا حصّہ مت بھولو بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کے ذریعے سے دارِ آخرت کو کماؤ۔

تو اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ جو کچھ میں نے تمھیں دے دیا ہے اس کے ذریعے سے دارِ آخرت کو کماؤ اور دیکھو کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ بھلائی کی ہے تو اسی طریقے سے تم بھلائی کرو اور دنیا کے اندر فساد مت پھیلاؤ اس لئے کہ یہ طاقت د

دولت بڑا فساد پھیلاتی ہے تو فساد مت پھیلاؤ، نیکی کی طرف اور اچھائی کی طرف اس کو خرچ کرو اور پھر اس کے بعد ایک اصول جو ہمیں بتایا گیا ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ دولت جمع کرنے کی اور اکتناز کی چیز نہیں ہے اور یہ دولت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور وہ اس لئے دی ہے کہ تم خلقت تک پہنچاؤ یہ نہ ہو کہ وہ اغنیاء کے بیچ میں گردش کرتی رہے، یہ نہ ہو کہ یہ دولت چند آدمیوں کے مابین گردش کرتی رہے، دیکھو یہ بات نہیں ہونی چاہیے، اور اس کے اندر اعتدال سے کام لو نہ اسراف کرو اور نہ بخل سے کام لو اس لئے کہ وہ شیطان ہی ہے جو تمھیں اعتدال سے ڈراتا ہے اور فحشار کی طرف ترغیب دیتا ہے، گویا اعتدال سے ہٹانے والے کو شیطان کہا گیا ہے تو نہ تم اسراف کرو نہ بخل سے کام لو اور اسراف کا مطلب میں آپ کو اور بتا دوں۔ جناب امام حسن علیہ السلام سخی ابن سخی ہیں، سخاوت انکے گھرانے کی چیز ہے تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا تھا وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا کرتے تھے امیر شام اس داد و دہش کو اسراف سمجھے، چنانچہ ایک خط میں جناب امام حسن علیہ السلام کو لکھا کہ لا خیر فی الاسراف اسراف کے اندر کوئی بھلائی نہیں ہے، امام حسن علیہ السلام نے اس کا جواب لکھا اور محض ایک فقرہ میں اسراف کی حقیقت کو واضح کر دیا آپ فرماتے ہیں کہ لا اسراف فی الخیر نیکی کے اندر سبقت کرو جتنی بڑھ سکتے ہو بڑھو جتنی تمھاری ہمت ہو اس کے اندر بڑھو، اسراف تو وہ ہوتا ہے جب تم اپنے مال کو غلط جگہ کے اوپر صرف کرتے ہو نمائش کے لئے صرف کرتے ہو محض اپنی جسمانی آسائش کیلئے صرف کرتے ہو تو وہ اسراف ہوتا ہے، خیر کے اندر کوئی اسراف نہیں ہوتا تو اب اسراف کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں؛ ایک طرف تو نقطۂ نگاہ کہ اسراف کے اندر کوئی اچھائی کی بات نہیں ہے اور دوسری طرف یہ بات کہ خیر کے اندر کسی قسم کا اسراف نہیں ہوا کرتا بلکہ خیر کے لئے تو یہ ہے کہ ہم اس خیر کے اندر ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں، جتنا زیادہ خرچ کریں اس لئے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یہ تو گویا اللہ تعالیٰ کو قرض دینا ہے، اس لئے تو قرآنی اصطلاح ہے کہ وہ قرض حسن ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قرض کو جس طرح سے لوٹائے گا تو کوئی سود خور کوئی بینک لتنے منافع کے ساتھ تمھارے

مال کو نہیں لوٹا سکتا ہے، تو یہ صورت قرض کی ہے کہ تم قرض دو اللہ تعالیٰ کو، تو اللہ تعالیٰ کو قرض دینا اس سے زیادہ تو محفوظ کوئی بینک نہیں ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ منافع کا تو کوئی سودا نہیں ہو سکتا، چنانچہ آپ دیکھیں کہ زکوٰۃ ہے اور خمس ہے اور صدقات ہیں یہاں تک کہ جو تمام سائل اور محروم ہیں انکا ایک حق معلوم ہے آپ کے مال کے اوپر، یعنی یہ کہ آپ کوئی کرم نہیں کر رہے ہیں۔ آپ ان کے اوپر احسان نہیں کر رہے ہیں، آپ کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے اگر آپ وہ حق نہیں دیتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کسی کا حق مار رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس مال کے اندر حق ہے ذوی القربیٰ کا اور یتیمی کا اور مساکین کا اور پردیسیوں کا، غریب اور مزدوروں کا اور اس حق کو کسی جگہ تو حقوق اللہ کہا گیا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ قرآن کے نقطۂ نگاہ سے یہ مال دیا اللہ تعالیٰ نے، آپکے پاس تو محض امانت ہے، آپ اس مال کے امین ہیں، آپ بندہ ہیں اور یہ آپ کا آقا بتا رہا ہے کہ اس مال کو کہاں خرچ کرنا ہے، کیسے خرچ کرنا ہے اور اس کے اندر کس کس کا حق ہے اور یہ باتیں یعنی مال کو اکٹھا کر کے رکھنا اور مال کو راہِ خدا کے اندر دینا تو یہ فرق ہے مومن اور کافر میں، کافر کو کسی پر توکل یا بھروسہ نہیں ہوتا چنانچہ اس کو تو ان دنیاوی وسائل کے اوپر بھروسہ کرنا ضروری ہے، اور مومن وہ ہے کہ جو ان دنیاوی وسائل کے اوپر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ اپنے اللہ کے اوپر بھروسہ کرتا ہے تو یہ اس طریقہ سے کچھ اصول ہمیں بتائے گئے، کلامِ پاک میں کسی نظام کا ذکر نہیں آیا بلکہ مال و دولت کی طرف ایک رویہ کا ذکر آیا ہے کہ اس مال و دولت کا صحیح مقام دینا کے اندر کیا ہے، تمھاری زندگی کے اندر کیا ہے اب جس حد تک ہم اس رویہ کو پیدا کر سکتے ہیں اسی حد تک ہم مسلمان ہیں اور اسی حد تک ہم اسلام کے تقاضے کو پورا کر سکتے ہیں، نظام سوشلزم کا ہو یا سرمایہ داری کا یا کسی اور طریقہ کا نظام ہو اس میں الجھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، کلامِ پاک نے جو اصول دیئے ہیں ان کو اپنے مدِ نظر رکھنا اور اپنی زندگی اور اس کے معاملات کو ان اصولوں سے مطابقت دینا ہے۔

گویا اب دین کی ایک تھوڑی سی جھلک، بہت ہی سطحی جھلک تو یہ ہے کہ اسکی ابتدا اللہ تعالیٰ کو ماننا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ماننا یہ خود اتنی بلیغ اور گہری بات ہو گئی کہ اس میں زندگی

کی بہت ساری باتیں سمٹ کر آگئیں۔ پہلے پہلے تو آزادی کی بات آگئی، یعنی اب آپ کا سر کسی بت کے سامنے نہیں جھکتا ہے، وہ بُت خواہ خارجی دنیا کا ہو یا آپ کے اندر کی دنیا کا یعنی اپنی ہوا و ہوس کا بت ہو تو اس کے سامنے سر نہیں جھکانا۔ عزیزانِ گرامی! آزادی کے معنیٰ یہ نہیں ہوا کرتے کہ آپ جو کچھ چاہیں وہ کریں اور اس طرح اپنی خواہشات کے غلام بن جائیں اس لئے کہ اس سے بدتر اور کوئی غلامی نہیں ہو سکتی، جو شخص اپنے نفس کا غلام ہے اس سے بڑا اور کوئی غلام نہیں ہے تو یہ ہوا و ہوس کے بُت جو آپ کے اندر ہیں تو ان کو اپنے دل سے نکالئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے کعبہ کو صاف کر کے، یہ دل اللہ کا کعبہ ہے، اس کے اندر جو بت ہیں وہ آپ کے ہوا و ہوس اور نفسانی شہوات کے بُت جو ہیں ان کو ذرا پاک کرنا ہے، ان کی غلامی سے آزاد رہنا ہے اور کوئی خارجی بت تو آپ کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہونی چاہیئے، نہ تو کثرت سے آپ خوف کھائیں گے اس لئے کہ اگر تمام کی تمام دنیا بھی آپ کے خلاف ہے تو کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی طرف ہے، کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آپ نصرت کر رہے ہیں اور کیا یہ اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت کرے گا تو گویا نہ تو کثرت کے بت سے آپ کو خوف کھانا ہے نہ دولت کے بُت سے آپ کو خوف کھانا ہے نہ طاقت کے بت سے آپ کو خوف کھانا ہے، اس لئے کہ یہ آپ کی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے نہ یہ آپ کو نفع پہنچا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جو یہ نفع آپ کو پہنچاتے ہوں حقیقت میں آپ کے لئے ضرر ہو، ممکن ہے کہ یہ ضرر جو آپ کو پہنچاتے ہوں حقیقت میں آپ کے لئے نفع ہو، یہ بت تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ ضرر کس کو کہتے ہیں اور نفع کس کو کہتے ہیں ہماری بات بھی یہی ہے کہ ہم خود یہ بات نہیں جانتے کہ کونسی بات ہمارے لئے نفع کی ہے اور کونسی بات نقصان کی ہے، البتہ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس موقع کے لئے کیا حکم دیتا ہے اور اس موقع کے لئے کیا حکم دیتا ہے، اور حکمت یہ ہے کہ ہم اس بات کو سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ جو بھی حکم دیتا ہے اس حکم کو بجا لانا ہمارا فرض ہے اور اپنے فرض کی بجا آوری ہی دراصل نفع کی بات ہے خواہ بظاہر اس میں ہمارے

ہمارے لئے کتنا ہی ضرر نظر آتا ہو یہ گویا حکمت کی انتہا ہے، تو ایک تو توحید کے معنی آزادی ہوئے اور پھر ساتھ ہی توحید کے معنی یہ ہوئے کہ اب ہم اپنے شرف تک پہنچ گئے، انسانی شرف تک، انسانی بلندی تک پہنچ گئے اس لئے کہ اب ہمارا سر اور کسی کے آگے نہیں جھکتا، اب ہمارا سر جو ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتا ہے اور اب ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خوف و رجا کا مقام کیا ہے کس سے اپنی امیدیں رکھنی ہیں اور کس سے ڈرنا ہے؟

عزیزانِ گرامی! ایک بات میں آپ سے عرض کروں اور وہ یہ ہے کہ جنّت و دوزخ کی جو تمثیلیں ہیں اور جنت و دوزخ جس کو کہتے ہیں تو وہ تمھاری طلب اور چاہت کی بات ہے، تمھاری وہ یا کہ جس کی تم سب سے زیادہ طلب کرتے ہو وہ تو جنت ہوئی اور اگر تم یہ بات چاہتے ہو اگر تمھاری کیفیت یہ ہے کہ تمھاری زندگی کا راستہ یہ ہے کہ خواہ تمھاری عزت چلی جائے، خواہ تمھارا ایمان مر جائے، خواہ تمھارا ضمیر مر جائے، لیکن دولت حاصل ہو جائے یا دربار کے اندر کرسی حاصل ہو جائے تو تمھاری جنت تمھیں مبارک اگر تم سب سے زیادہ اس بات سے ڈرتے ہو کہ چاہے دنیا ناراض ہو جائے کتنی ہی سختی ہو جائے، کتنی ہی کڑی منزلوں سے گزرنا ہو لیکن اللہ تعالیٰ کا غضب تم پر نہ ہو تو یہی دوزخ سے بچنا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب در اور اس کی ناراضگی جہنم ہے اور اسی سے بچنے کی آپ کوشش کرتے ہیں تو جنت رضائے الٰہی کو کہتے ہیں اور دوزخ غضبِ الٰہی کو کہتے ہیں، اگر تم کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ کن چیزوں کی طلب کرنی ہے اور کن چیزوں سے اپنا دامن بچانا ہے تو گویا ایک اللہ تعالیٰ کو ماننے سے اتنی ساری باتیں جو ہیں تو وہ حاصل ہو جاتی ہیں اور ہمیں یہ بتا دیا گیا کہ دیکھو انسانیت کا جو ایک پیمانہ ہے، تم اپنا خواہ کوئی پیمانہ بناؤ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو پیمانہ ہے تو وہ یہ ہے کہ جو تقویٰ میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے تو وہی سب سے بلند ہے، وہی سب سے زیادہ مکرم ہے وہی سب سے زیادہ اشرف ہے، اب یہ بات کہ

تم اپنے آپ کو اکرم و اشرف سمجھو چونکہ تم کرسی کے اوپر بیٹھے ہوئے ہو اور جب نماز پڑھانے کا موقع آئے تو جو (Boss) ہے وہی نماز پڑھائے تو ممکن ہے باس Boss کے پیچھے جو چپراسی کھڑا ہے تو وہ تقویٰ میں باس (Boss) سے کہیں زیادہ بلند ہو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے اندر اس کا کہیں زیادہ بلند ہو اور وہ زیادہ حق اس بات کا رکھتا ہو کہ وہ نماز کی امامت کرے لیکن تمھارے پیمانے کچھ اور ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پیمانے کچھ اور ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا پیمانہ بتایا اور وہ اس لئے بتایا کہ دیکھو لوگو تم بھی جب عزت کرو تو اس بات کی مت کرنا کہ کوئی بڑی طاقت رکھنے والا ہے بلکہ عزت اس بات کی کرنا کہ تقویٰ کس میں زیادہ ہے، کون برائیوں سے زیادہ بچتا ہے اور کون نیکیوں کی طرف زیادہ بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ معیار ہمیں بتایا اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے تمام کے تمام تعلقات واضح کر دیئے، یعنی عدل کے معنی ہمیں بتائے کہ خدا کو اپنی جگہ رکھو اس کائنات کو اپنی جگہ رکھو اور انسان کو اپنی جگہ رکھو، ضمناً میں ایک نکتہ بیان کروں، اس کائنات کے لئے یہ بتایا کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمھارا رزق اس کے اندر رکھا ہے، آسمانوں سے پانی گرتا ہے، زمین رزق پیدا کرتی ہے، اس کے اندر تمھارا رزق ہے، تم اپنا رزق تلاش کرو وہ اللہ تعالیٰ کا فضل جو ہے اس کے اندر تو وہ تلاش کرو۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ اس کے خزانوں کو اپنی آرام و آسائش کے لئے کام میں لاؤ، ان کو لوٹ کھسوٹ کر کھا جاؤ اور اگر تم یہ بات کرو گے یعنی اللہ تعالیٰ کے خزانوں کو اس طرح سے لوٹو گے تو اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کے اوپر غاصبوں کو بھی آنے دیتا ہے، وہ اپنے پیدا کئے ہوئے بندوں کو اپنا خصم مبین بننے کی بھی اجازت دیتا ہے اور وہ اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ اس کے خزانوں کو لوٹا بھی جا سکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ تمام دنیا کے اندر ایک خرابی پھیلے گی اور ہوائیں آپ کے خلاف ہوں گی کہ وہ زہریلی ہو گئی ہیں اور سمندر رود دریا کے پانی وہ آپ خلاف ہوں گے، زمین باوجود اپنی فراخی کے تنگ

ہو جائے گی یہ زمین جو رزق اگلتی ہے اس کے اندر رزق کی کمی آجائے گی، پھر تم آدمیوں کا گلا گھونٹنا شروع کر دگے کہ دنیا کے اندر آدمی بہت زیادہ ہو گئے اور تم اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ یہ ماحول زہریلا ہو چکا ہے اور انسان کی زندگی کے قابل نہیں رہا بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ یہ تمام چیزیں جو انسان زندگی کی بقاء کے لئے، انسان کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ یہی اس کی ہلاکت اور بربادی کا سبب بن جائیں گی، اور وہ اس وجہ سے کہ ہم عدل سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ ہم چیزوں کو ان کی صحیح جگہ پر نہیں رکھتے، ہم ہر چیز کو اپنی ملک سمجھنے لگے ہیں، اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ دیکھو یہ ہوائیں تمھاری نہیں ہیں یہ میری ہیں، یہ زمین میری ہے، یہ پانی میرا ہے، یہ دنیا کے خزانے میرے ہیں جس طرح میں بتاتا ہوں تو اس طرح ان کو استعمال کرنا ہے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں، اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی آیات ہیں، ان سے محبت کرو، ان کی عزت کرو، ان کا احترام کرو، یہ زمین تمھارے لئے رزق پیدا کرتی ہے ایک دانہ تم بوتے ہو اور اللہ تعالیٰ اپنی برکت سے سو دانے اگا دیتا ہے تو اس کی تم قدر کرو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس سے تم تمتع کرو، فائدہ حاصل کرو، اسے اپنی کنیز مت سمجھو، اسی طرح انسان سے انسان کے جتنے تعلقات تھے وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ نے بتا دیئے کہ بیوی سے کیسے تعلقات ہوں اولاد سے کس قسم کا تعلق ہو محبتیں کس حد تک جائیں، کون سی ان کی حد ہے، سب سے بڑی محبت کون سی ہے، دشمن سے کس طرح سے سلوک کیا جاتا ہے۔ عزیزو! کلام پاک کے اندر دشمنوں سے تو خاص طور کے اوپر سلوک کرنے کو کہا گیا ہے کہ دیکھو کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات کے اوپر نہ ورغلا دے کہ تم اس کے ساتھ زیادتی کرنے لگو، وہ جو حد کھنچی ہوئی ہے اس حد سے آگے نہیں بڑھنا ہے اور دشمنی کی اپنی ایک جگہ ہے، اس بات کو تم مت بھولو کہ تمھارا واسطہ تو اللہ کے بندوں سے ہی پڑ رہا ہے، وہ کافر ہوں یا مومن ہوں۔ اگر کافر ہیں تو بھی وہ تمھارے ساتھ اس بات میں شریک ہیں کہ ان کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور تمھیں بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور اگر مومن ہیں تو وہ تمھارے اخو فی الدین

ہیں تمہارے دین کے اندر بھائی ہیں ۔ یہی بات جناب امیرالمومنینؑ نے اپنے گورنر کو لکھ کر بھیجی تھی کہ اس حقیقت کو مت بھول جانا ، انسانیت کو مت بھلا دینا۔ اس موقعہ پر میں آپ سے ایک بات عرض کرتا ہوں اور وہ یہ کہ انسانوں سے متعلق جو مسئلہ بھی ہوتا ہے وہ اقتصادی مسئلہ ہو یا سیاسی مسئلہ ہو یا معاشرتی مسئلہ ہو اس کا ایک انسانی پہلو ہوتا ہے انسانی پہلو کو سامنے رکھنا یہ ایمان ہے اور انسانی پہلو کو نظر انداز کر دینا یہ کفر ہے یہ اللہ تعالیٰ کو بھولنا ہے اور اس طرح کی باتیں کرنا کہ ہمارے تو ایک ہزار آدمی مرے مگر دوسری طرف پانچ ہزار آدمی مرے تو عزیزو! آدمی جو ہے تو وہ گننے کی چیز نہیں ہوتی ہے، آدمی تو بجائے خود ایک حقیقت ہوتا ہے تو اپنے معاملات میں انسانی پہلو کو مت بھولو اور وہ انسانی پہلو اللہ تعالیٰ یا اپنے حکم کے ذریعے یاد دلاتا رہتا ہے، اس کو مت بھولو اور ایسے معاشرے کو اور ایسی قدروں کو قائم کرنے کے لئے تم جہاد کرو گویا اگر بدر کا موقع ہے تو اس وقت جہاد کرو اور اگر یہ قدریں ختم ہو رہی ہیں تو اس وقت تم جہاد کرو، یعنی کربلا کا موقع آئے تو اس وقت جہاد کرو اسلام کا اصول یہی ہے ، زمانہ جیسے جیسے بدلتا چلا جائے تو تم دیکھتے رہو کہ کس طرح سے اس اصول کو عمل کے اندر لایا جاسکتا ہے ، یہ اجتہاد کہلاتا ہے ، اجتہاد کی تعریف یہ ہے کہ وہ اٹل اصول وہ ناقابلِ تبدیل اصول جو دین کے اصول ہیں بدلتے ہوئے زمانے کے اندر کس طریقے سے ان کا اطلاق ہو، کس طریقے سے ان کو بروئے عمل لایا جائے یہ اجتہاد ہے اور پھر یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ اور یہ امت اسکو ہم نے اس لئے پیدا کیا کہ یہ تمام انسانوں کو خیر کی طرف لائے اور نماز قائم کرے ، اور ایتائے زکوٰۃ قائم کرے ، امر بالمعروف کرے نہی عن المنکر کرے اور قائم بالقسط ہو، قسط اور عدالت کے اوپر قائم ہو ، اور اس جماعت کی کیا خصوصیت بتائی ، اس جماعت کی یہ خصوصیت بتائی کہ محمدؐ اللہ کا رسولؐ ہے گویا مرکز تو ذاتِ محمدیؐ ہے اور اس کے چاروں طرف اس قسم کے آدمی ہیں کہ جو کافروں کے اوپر بہت سخت ہیں ، جو آپس میں بڑے رحم دل ہیں جو رکوع کرتے ہیں ، جو سجدہ کرتے ہیں ، جو اللہ تعالیٰ کے فضل کی تلاش کرتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی ہر حال میں ہر کیفیت میں عبادت کرتے ہیں اور تم ان کے چہروں سے

اور ان کی پیشانی سے پہچان جاؤ گے، اب اس کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ عزیزو! معیتِ رسولؐ کے، رسولؐ کے ساتھ ہونے کے بہت سارے درجے ہیں اور بہت سارے معنی ہیں جیسے مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ ہے، بیشک وہ ہر بندے کے ساتھ ہے، وہ گنہگار بندہ ہو یا نیک بندہ ہو اللہ تو ہر بندے کے ساتھ ہے، تم جہاں ہو، جس حالت میں ہو اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ تمھاری طرف نگاہ کر رہا ہے تو معیت کے ایک معنی یہ ہوئے، دوسری معیت جو ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ محسنین کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے کہ جو اس کو پکارتے ہیں تو اس ساتھ ہونے کی نوعیت دوسری ہے۔ یہ معیت نزدیکی اور قربت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ ساتھ انتقام لینے کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ مومن اور متقی بندوں کے ساتھ ہوتا ہے تو اس لئے کہ ان کی نصرت کرے، اور دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ نہ ہو تو گویا معیت کے بہت سارے معنی ہوئے، اب معیتِ رسولؐ کے بارے میں کم بصیرت رکھنے والے لوگوں نے یہ بات کہی کہ رسولؐ اللہ کے ساتھ جتنے بھی آدمی تھے تو یہ ان کی تعریف آئی ہے اور فلاں جو تھا تو اس کے لئے تو یہ ہے کہ وہ کفار کے اوپر بہت سخت تھا اور فلاں کے لئے یہ تعریف آئی ہے کہ وہ بڑا نرم دل تھا، اور فلاں کیلئے یہ تعریف آئی ہے کہ وہ ہمیشہ رکوع اور سجدے کیا کرتا تھا، تو اس بات کو جو کلامِ پاک میں آئی تھی کس طرح الجھایا گیا۔ عزیزو! کلامِ پاک تو ایک معیار قائم کرتا ہے اور وہ یہ بات کہتا ہے کہ رسولؐ کی معیت اگر تم ڈھونا چاہتے ہو اور یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ رسولؐ کی معیت اور ساتھ کے کیا معنی ہیں تو یہ سب کی سب صفات ہیں ان کو اکٹھا دیکھ لو، یہ کسی جگہ نہیں ہے کہ ایک مومن کے اندر ایک خصوصیت ہوگی اور دوسرے مومن کے اندر دوسری خصوصیت ہوگی، یہ بات نہیں ہو سکتی کیونکہ رسولؐ کے ساتھ تو منافق بھی موجود تھے، کلامِ پاک اسکی گواہی دیتا ہے کہ ان کے ساتھ بہت سارے منافق موجود تھے اور یہ بات کہ کوئی مکانی اعتبار سے یا زمانی اعتبار سے محمدؐ مصطفیٰ کے ساتھ ہو اس کے اوپر

اس آیت کو کسی طرح منطبق کر دیا جائے تو یہ بات چلنے والی نہیں ہے بلکہ ان آدمیوں کا تو مقصد یہ ہے کہ ہمارے لئے ایک معیار قائم ہو گیا کہ معیتِ رسولؐ کے کیا معنی ہوتے ہیں اور وہ معنی یہ بتائے گئے کہ رسولؐ کے ساتھ والے جو ہیں ان کی خصوصیت جو ہے تو وہ یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ ان کے خوف اور امید کا مرکز اللہ ہوتا ہے۔ ان کی محبت اور ان کی دشمنی سب اللہ کے لئے ہوتی ہے اور یہ رکوع و سجود، عزیزو! یہ رکوع و سجود یہ تمھارے لئے نشانیاں ہیں یہ علامتیں ہیں اس بات سے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے محض رسمی نماز کے لئے جھک گئے یا زمین کے اوپر سر رکھ دیا تو یہ رکوع و سجود نہیں ہوتا، بلکہ قیام دراصل اس تیاری کی علامت ہے کہ یا اللہ ہم تیرے سامنے حاضر ہیں جو تیرا حکم ہو وہ بجا لائیں اور رکوع کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کے حکم کی اطاعت کے لئے جھک رہے ہو اور جس وقت کہ تم سجدہ کرتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنی خودی کو مٹا رہے ہو اور اللہ کے سامنے موجود ہو تو گویا یہ ترکِ خودی کا جو بلند مرتبہ ہے اسی کو کہتے ہیں کہ یہ مومن کی معراج ہے، اور سجدے کو معراج اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اس کے اندر اپنی خودی سے آدمی دُور ہو جاتا ہے اور جتنا خودی سے دُور ہوتا ہے اتنا وہ خدا سے نزدیک ہو جاتا ہے اور یہ قعود جو ہے یہ اس کے دروازے کی طرف نگاہ لگا کر بیٹھنا ہے کہ جس وقت تم اپنی خودی کو ترک کر چلے تو اس وقت تم توکل علی اللہ کئے بیٹھے ہوئے ہو یار کا در تمھارے سامنے ہے اسکے در کی طرف نگاہیں ہیں، اپنے گھر کی طرف تمھاری پیٹھ ہے، اپنا گھر چھوڑ دیا، اپنی خودی چھوڑ دی اور یار کا در سامنے ہے اور اس کے اوپر تم توکل کئے بیٹھے ہو، یہ قعود کی منزل ہے اس طریقے سے جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ رکوع کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ رسمی طور سے رکوع کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں بلکہ وہ ہر وقت تیار ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہوتا ہے اور جو کچھ بھی حکم ہو اس کے لئے وہ سر جھکائے ہوئے ہیں اس لئے وہ رکوع کی حالت میں ہیں وہ ہر وقت اللہ کی اطاعت کے لئے جھکے ہوئے ہیں، ان کا مرنا ان کا جینا ان کا اٹھنا، ان کا جاگنا، ان کے تمام کام، تمام کی تمام عبادتیں اللہ تعالیٰ کے لئے وقف ہیں، یہ گویا رسولؐ کی معیت کا معیار بنتا چلا جا رہا ہے۔

معیتِ رسولؐ کی جو بلند منزل ہے تو وہ منیت کی منزل ہے کہ جس کو رسولؐ یہ کہے کہ میں اور یہ شخص ایک ہی نور سے ہیں یا رسولؐ یہ کہے کہ میں حسینؑ سے ہوں حسینؑ مجھ سے ہے۔ یہ منیت کی منزل کہلاتی ہے۔

گویا وہ دو چیزیں ہیں بظاہر الگ الگ نظر آتی ہیں مگر وہ ایک ہوجاتی ہیں تو گویا یہ اس معیت کی اس ساتھ کی ایک بلند منزل ہے، اب اس معیت کو اگر تم دیکھنا چاہو اور اس کو دیکھنا چاہو کہ ساتھ دینا کس کو کہتے ہیں اور صحابی ہونا کس کو کہتے ہیں تو وہ کربلا کے میدان کے اندر دیکھو کہ معیت کس کو کہتے ہیں اور ساتھ کس طرح دیا جاتا ہے۔

عزیزو! یہ جو امام حسین علیہ السلام کے ساتھی ہیں تو ان کے لئے نہ سن کی قید ہے نہ سال کی قید ہے، نہ دولت کی ضرورت ہے نہ اس کے اندر طاقت کی ضرورت ہے، نہ یہ بات ہے کہ یہ کتنے سارے آدمی اپنے ساتھ لاسکتا ہے یا یہ کہ یہ اتنی دولت خرچ کرے۔ اور لشکر کو بنا سکتا ہے، اور نہ یہ قید ہے اس کے اندر کہ وہ بہت بوڑھا ہوگیا، نہ یہ قید ہے کہ یہ بہت چھوٹا ہے ابھی لڑنے کے قابل نہیں ایک صفت (qualification) ہے ایک قید ہے، ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ اس کے اندر زہد و تقویٰ کتنا ہے، وہ زہد و تقویٰ اس درجے کا ہے یا نہیں ہے کہ اس عزت کے اور اس اعزاز کے وہ قابل ہوسکے کہ اس موقع کے اوپر کہ جب مشیتِ خداوندی پوری ہو رہی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کا مقصد پورا ہو رہا ہے اور جب اسلام کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہے اس وقت اس اعزاز میں وہ شریک ہوسکے بس یہ دیکھنا ہے کہ اس کے اندر دعوتِ حق پر لبیک کہنے کی جرأت ہے یا نہیں، اور یہ دیکھنا ہے کہ اللہ کے راستے کے اندر قربانی دینے کی انتہائی تڑپ بھی اس کے دل میں موجود ہے یا نہیں، سوائے اس کے اور کسی قسم کے اوصاف ( ) کی ضرورت نہیں ہے، اور جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات ہیں تو ان کو جناب امام حسین علیہ السّلام خط لکھ لکھ کر بلاتے ہیں جس طرح سے لشکر کو بلایا جاتا ہے اسی طرح سے ایک مردِ ضعیف حبیب ابن مظاہر کو خط لکھ کر بلایا جارہا ہے کہ حبیب ابن مظاہر ہمارے حق کو پہچانتے ہو اور ہمارے اوپر یہ وقت پڑا ہے تو تم نصرت کے لئے آجاؤ۔ کیوں ایسا کیا جارہا ہے

وہ اس لئے کہ جو سعید ارواح ہیں ان کو اگر جمع نہ کریں تو امامؑ کا مشن مکمل نہ ہو، امام تو گلّے کا نگہبان ہوتا ہے، اس کی تو اپنے ایک ایک ماموم کے اوپر نظر ہوتی ہے، اس کو تو یہ معلوم ہے کہ کون اس کی اہلیت رکھتا ہے اور کس کا یہ مقدر ہے کہ وہ اس جہاد میں شریک ہو تو وہ ان کو اس طریقے سے بلاتا ہے۔ جناب زینبؑ پوچھتی ہیں بھیّا کس کو خط لکھا۔ جناب زینبؑ شب و روز یہ دیکھ رہی ہیں کہ ایک لشکر آتا ہے، دوسرا لشکر آتا ہے، تیسرا لشکر آتا ہے۔ اس طرح تمام میدان بھرتا چلا جاتا ہے۔ یہ سب مخالف لشکر ہے۔ ادھر کوئی مدد کے لئے نہیں آتا، کوئی قبیلہ نہیں آتا، کوئی لوگ نہیں آتے تو وہ کہتی ہیں کہ بھیّا کچھ لوگوں کو نصرت کے لئے بلالو۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں حبیب کو بلا رہا ہوں جو میرا پرانا ساتھی ہے اور پرانا رفیق ہے۔ جناب زینبؑ یہ سنکر فرماتی ہیں "بھیّا! اگر حبیبؓ کو خط لکھ رہے ہو تو میری طرف سے یہ بھی لکھ دینا کہ حبیبؓ اگر آنا ہے تو جلدی آنا۔ دیر مت کرنا۔"

نویں مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمام حمد خدائے رحمٰن کو جس نے قرآن کی تعلیم دی، جس نے انسان کو پیدا کیا اور بیان کا ملکہ اس کو عطا کیا، بے شک ہر انسانی بیان کی حد اور اس کی انتہا قرآن ہے جس طرح انسان کا منتہا اللہ تعالیٰ ہے تو اسی طرح انسانی بیان کا منتہا قرآن ہے، ہر سچی بات، ہر کلمۂ صدق قرآن سے پیدا ہوتا ہے اس لئے کہ قرآن انسان کے بیان سے پہلے ہے اور ہر کلمۂ صدق قرآن کی طرف اشارہ کرنے والا ہے اور یہ سورج اور چاند ایک حساب سے چل رہے ہیں ایک قانون کے ماتحت چل رہے ہیں، یہ جڑی بوٹیاں یہ درخت سجدہ کر رہے ہیں اور آسمانوں کو اس نے رفعت دی ہے اور میزان کو اس نے اتارا، مختلف اجزا کو مختلف مزاج کی چیزوں کو یا موافق مزاج کی چیزوں کو ترکیب دینا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، ہر چیز کو ایک قدر اور اندازے کے ساتھ آپس میں ملایا یہ اس کی میزان ہے، اس کی ترازو ہے، یہ توازن جو قائم ہے یہ کائنات کے اندر اس کا عدل ہے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے سات آسمان مطابقت کے ساتھ پیدا کئے اس رحمٰن کی ایجاد کردہ کائنات میں اس کی خلق کردہ کائنات میں کیا تم کسی قسم کا تفاوت پاتے ہو کیا اس کے نظم میں کوئی خرابی یا اس کی ترکیب میں کوئی نقص تمھیں نظر آتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کہتا ہے کہ پھر دیکھو اپنی نظروں کو چاروں طرف دوڑاؤ اور بتاؤ کہ کیا تمھیں کوئی فتور نظر آرہا ہے کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ مختلف چیزیں مختلف مزاج کی چیزیں ایک نظم کے اندر نظر آرہی ہیں، ایک اندازے کے مطابق وہ سب کی سب آپس میں ملی ہوئی ہیں، پھر اور دیکھو اور بار بار دیکھو اور تمھاری نگاہیں تھک کر واپس آجائیں گی۔ مگر تمھیں اس کائنات میں کوئی

فتور نظر نہیں آئے گا۔ یہ کائنات کے اندر اللہ تعالیٰ کی میزان ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ میزان کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میزان کے معاملے میں کمی بیشی مت کرنا اور تمھارے جو معاملات ہیں اس کے اندر پورا ناپ تول رکھنا یہ عالم تشریع کے اندر میزان ہے، گویا عالمِ تکوین میں بھی اس کی میزان ہے اور عالمِ تشریع کے اندر بھی اس کی میزان ہے، عالمِ تکوین میں اس کی جو میزان قائم ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی اور عالمِ تشریع میں بھی ہمیں یہ حکم ہے کہ اس میزان کے اندر کمی یا زیادتی نہ ہونے پائے اور میں درود بھیجتا ہوں محمد مصطفےٰ پر جو انبیاء میں خاتم النبیین تھے جن کو آیاتِ بینات کے ساتھ دنیا کے اندر بھیجا گیا جن کے اوپر حق کے ساتھ کتاب نازل کی جن کے ساتھ میزان اتاری گئی اور وہ اس لئے اتاری گئی تاکہ دنیا قسط اور عدل کے اوپر قائم ہو، ایک توازن کے اوپر قائم ہو کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہ ہونے پائے، اور میں سلام بھیجتا ہوں ائمہ ہدیٰ پر جن کا بیان قرآن کا ترجمان ہے اور جن کا عمل اس دنیا کے اندر میزان ہے، جو بولتے ہوئے قرآن تھے اور جو اللہ تعالیٰ کے عدل کی ترازو تھے لا تطغوا فی المیزان میزان کے اندر زیادتی مت کرنا، اپنے معاملات کے اندر عدل سے مت ہٹنا اپنا حساب صاف رکھنا، ناپ تول ٹھیک رکھنا، اس ناپ تول کے اندر کمی نہ کرنا۔

عزیزانِ گرامی! دنیا کے ادیان کی تاریخ اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں رہی، اعلیٰ یا ادنیٰ، وہ چاند سورج ہوں، شجر حجر ہوں یا حشرات الارض ہوں جس کے سامنے انسان کی پیشانی نہ جھکی ہو، شمس و قمر کو اس نے اپنا خدا بنایا، شجر و حجر کو اس نے اپنا معبود بنایا یہاں تک کہ حشرات الارض کو بھی اس نے اپنا معبود بنایا یعنی انسان کے گرنے کی اور انسان کے تنزل کی کوئی انتہا نہیں۔ جس طرح انسان کے ارتقاء کی کوئی انتہا نہیں ہے، پچھلی صدی میں جو ارتقاء (EVOLUTION) کا تصور بہت زیادہ عام ہوا تو پھر اللہ تعالیٰ کے تصور کی تاریخ اور اس کے ارتقائی مدارج کا بھی بیان کیا جانے لگا، فلاسفۂ مذہب کے جو عالم تھے انھوں نے یہ بات کہی کہ کائنات ے جتنے بھی مذاہب ہیں ان میں کائنات کے عوامل اور طاقتوں اور اپنے آباء کی ارواح کی

پرستش سے رفتہ رفتہ تدریجی طور پر انسان اللہ تعالیٰ کے تصور تک آیا ہے۔ شروع میں انسان اپنے آپ کو بڑا مجبور پاتا تھا، اس کی سمجھ میں کائنات کا نظام نہیں آتا تھا، وہ خوف ورجا کی کیفیت کے اندر تھا اور وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ جس طرح بہت ساری باتیں ایسی ہیں کہ جو وہ اپنے ارادے سے کر سکتا ہے تو اسی طرح سے کچھ ایسی ہستیاں بھی ہیں جو بڑی طاقت رکھنے والی ہیں کہ جو ایسے کام بھی کر سکتی ہیں کہ جو وہ نہیں کر سکتا تو ان تدریجی مراحل سے گزر کر رفتہ رفتہ انسان خدائے واحد کے تصور تک پہنچا۔ اکثر حکماء، تو چونکہ مغرب کے ملکوں کے ہیں کہ جہاں عیسائیت مذہب ہے تو ان کے نزدیک اس تصور کی انتہا خدا کے تصور کی تثلیث ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے آگے تو اور کچھ نہیں ہے تو وہ تثلیث کو وحدت کی (TERM) اصطلاح کے اندر تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کلامِ پاک میں اس سے مختلف بات ہے۔ کلامِ پاک ہمیں یہ بات بتاتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ انسان کسی ارتقاء کے ذریعے سے یا کسی تدریج کے ذریعے سے، کسی استقرائی ذریعے سے کوئی (INDUCTION) کے ذریعے سے یا کسی تخریج (DEDUCTION) کے ذریعے سے اللہ کے تصور تک پہنچا ہو بلکہ یہ توحید کا علم لا الٰہ الا اللہ کا تصور یہ اللہ تعالیٰ نے وحی کیا اپنے مصطفیٰ بندوں کے اوپر پھر لوگ اپنی غفلت کی وجہ سے، اپنی بغی کی وجہ سے یہ سبق بھولتے چلے گئے، اس حقیقت سے غافل ہوتے چلے گئے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے مجتبیٰ اور مصطفیٰ بندوں کے ذریعے بار بار یہ سبق ان کو یاد دلاتا چلا گیا۔ تو کلامِ پاک ہمیں یہ بات بتاتا ہے کہ یہ ایک تنزل کا راستہ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بار بار اپنے کرم کی وجہ سے، اپنی رحمت کی وجہ سے اپنے بندوں کی طرف توجہ کی اور ان کو یہ سبق یاد دلایا جاتا رہا، تو صورت یہ نہیں ہے کہ خدا کے تصور تک کسی تدریجی ارتقاء کے ذریعے پہنچا گیا ہو۔ بات یہ نہیں ہے کہ کثرت سے وحدت کی طرف انسان چلا ہو بلکہ کلامِ پاک کا نکتۂ نظر اس کے برعکس ہے یعنی انسان توحید سے شرک کی طرف گیا۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بت پرستی کی طرف تنزل کیا اور اب بہت سے حکما بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ان قوموں اور قبیلوں کے اندر

کہ جن کو تہذیب میں بہت پسماندہ سمجھا جاتا ہے تہذیب کی ابتدائی شکل نہیں ہے۔ بلکہ وہ کسی بڑی تہذیب کے باقی بچے ہوئے نشانات ہیں اس لئے کہ اگر یہ تہذیب کی ابتداء ہوتی تو پھر وہ تہذیبی ارتقاء کے مراحل سے گزرتے۔ لیکن وہ اس جگہ کے اوپر ہیں کہ جہاں قدیم تہذیب کے آثارِ باقیہ کے طور کے اوپر موجود ہیں لیکن ان کی تہذیب کسی زمانے میں تھی بہت قدیم تو وہ اللہ تعالیٰ کے اعتقاد سے گرتے گرتے اس بت پرستی تک آئے ہیں، یہ بات نہیں ہے کہ ادھر سے اٹھتے ہوئے اللہ تعالیٰ تک پہنچے ہوں اس لئے کہ ایسی کوئی منزل نہیں ہے کہ جہاں انسان کسی دلیل کے ذریعے سے یا کسی استقرا کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ تک پہنچے ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی موجودگی اور اللہ تعالیٰ کے حاکم ہونے کا شعور ہمیشہ بھی لوگوں کے ذہن کے اندر تھا چنانچہ حضورؐ کے متعلق بھی یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ اور میرے اوپر وحی کی گئی ہے جس طرح مجھ سے پہلے نبیوں کے اوپر وحی کی گئی تھی کہ سوائے اس خدا کے اور کوئی اللہ نہیں۔ اب اس بات کو آپ دیکھیں کہ سوائے خدا کے کوئی اور اللہ نہیں ہے تو اس سلسلے کے اندر کہ جس میں اتنے انبیاء ہوتے چلے آئے ہیں یہ مخصوص کلمہ کوئی نئی بات نہیں تھی جس طرح سے اور بہت ساری عام باتیں ہیں تو ہم بھی یہ بات جانتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی اللہ نہیں ہے لیکن حضورؐ کے لئے کلامِ پاک میں یہ ہے کہ یہ بات آپ پر وحی کی گئی گویا یہ بات یہ بڑی زبردست حقیقت، یہ انقلاب انگیز حقیقت یہ دنیا کو اور انسان کو بدلنے والی حقیقت یہ وہ نہیں کہ جیسے ہم اور آپ زبان سے دہرا دیا کرتے ہیں بلکہ یہ وہ بات ہے جو وحی کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے مصطفےٰ اور مجتبیٰ بندوں پر اس کلمہ کو وحی کرتا ہے۔

اور جن کو اس توحید کی تعلیم براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ملتی ہے وہ اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ہوتے ہیں۔ ہم ان کی تعلیم کے ذریعے سے اسلام لائے، اوّل المسلم وہ ہوتا ہے کہ جس کو براہِ راست وحی کی جاتی ہے، براہِ راست تعلیم دے دی جاتی ہے، وہ محمدؐ مصطفےٰؐ ہوں یا جناب ابراہیمؑ۔ ایک بات میں آپ سے اور عرض کروں اور وہ یہ ہے کہ اس کے اندر ایک نکتہ اور بھی پنہاں ہے اور وہ نکتہ یہ پنہاں ہے کہ اس لَآ اِلٰہ

الاّ اللہ کو ایک رسمی کلمہ مت بنانا کہ تمھاری زبان لاَ اِلٰہ الاّ اللہ کو دہرا رہی ہے لیکن اس میں جو کچھ اسرار ہیں جو کچھ نتائج ہیں اور جو کچھ معنویت ہے اس کو تمھارا دماغ اور قلب قبول نہیں کر رہا ہے یا اس کی طرف سے غافل ہے اور بس تمھاری زبان جو ہے تو وہ اس کلمہ کو دہرا رہی ہے بلکہ وحی کی طرح سے جس میں انسان کی جتنی بھی طاقتیں ہو سکتی ہیں، جتنے بھی قویٰ ہو سکتے ہیں اس کا قلب اس کا دماغ سب کے سب اس میں INVOLVE ہوتے ہیں تو اس طرح سے لاَ اِلٰہ الاّ اللہ کے کلمہ کی ادائیگی کو اس درجے تک لے جانا ہے کہ جو وحی سے نزدیک تر درجہ ہو یہاں تک کہ تمھیں یہ نظر آنے لگے کہ اس حقیقت کے علاوہ اور دنیا میں کچھ ہے ہی نہیں تو یہ وہ کلمہ نہیں جسے زبان سے رسمی طور پر دہرایا جائے بلکہ یہ انقلاب انگیز کلمہ ہے، یہ شعور کو بدلنے والا کلمہ ہے، دنیا اور کائنات کو بدلنے والا کلمہ ہے اور یہ کلمہ وہ ہے جو وحی کئے جانے کے لائق ہے اور جسے اللہ تعالیٰ وحی کرتا ہے اپنے مصطفےٰ و مجتبیٰ بندوں پر اور وہ اس کلمہ کی تعلیم دیتے ہیں۔

عزیزانِ گرامی! ایک بات آپ یہ دیکھیں کہ ہمیں یہ بات بتائی گئی ہے کہ دین کی جو پہلی منزل ہے وہ بھی معرفت ہے اور آخری منزل دین کی تو وہ بھی معرفت ہے اور یہ وہ منزلِ معرفت ہے جہاں اللہ تعالیٰ کا سب سے بہتر اور اللہ تعالیٰ سے سب سے نزدیک بندہ یہ کہے کہ یا اللہ ہم تیری معرفت نہیں کر سکے جو معرفت کا حق تھا، گویا دین کے اندر تو ابتدا، معرفت سے ہوتی ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے اندر اپنی روح پھونکی ایک لطیفۂ غیبی عطا کیا کہ جس کے ذریعے سے تمھیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو اگر تمھارے اندر نہ ہوتا تو تم اللہ تعالیٰ کی معرفت کبھی نہ حاصل کر سکتے تھے تو دین معرفت سے شروع ہوتا ہے اولِ دین جیسا کہ امیرالمومنینؑ نے فرمایا وہ معرفت ہے اور اس معرفت کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس لئے کہ سب سے آخری انتہا جو ہماری نظر میں ہو سکتی ہے اس کے اوپر دیکھتے ہیں کہ خیرالبشر کھڑا ہوا یہ بات کہہ رہا ہے کہ ہم نے تیری معرفت حاصل نہیں کی جو حق تھا اس معرفت کا، اور اس ابتدار

اور انتہا کے بیچ میں تمام کی تمام منزلیں جن کا ذکر امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے یعنی تصدیق کی منزل آجاتی ہے، توحید کی منزل آجاتی ہے، اخلاص کی منزل آجاتی ہے اور اخلاص کی گہرائیوں کو تو کوئی بھی نہیں پاسکتا ہے تو یہ تمام کی تمام منزلیں درمیان کی ہیں۔

اول معرفتِ خدا اور بعد میں معرفتِ خدا، بیچ میں بے انتہا منزلیں ہیں اور جس چیز سے ابتدا ہوتی ہے وہ کسی استقرائی طریقے یا صغریٰ اور کبریٰ کو جوڑ کر نتیجہ نکالنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ معرفت سے شروع ہوتی ہے۔ دین کی ابتدا ہی معرفت ہے تو یہیں توحید کے متعلق اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه سے متعلق یہ بات بتائی گئی، اور عزیزانِ گرامی! یہ معرفت جو حاصل ہوتی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے، لیکن یہ اکثر و بیشتر ہوتی ہے کسی شخص کے ذریعے سے۔ کتاب تمہارے پاس اب بھی موجود ہے اور یہ وہی کتاب ہے جو محمد مصطفیٰؐ کے زمانے میں تھی، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کے اندر یقین یوں کمزور ہوتا چلا جارہا ہے کہ اللہ والے لوگوں کی ذرا کمی ہوگئی ہے اور یہ سلسلہ تم دیکھو کہ اللہ والے جو ہوتے ہیں، اہلِ حق جو ہوتے ہیں جو صحیح معنوں میں بندگانِ خدا ہوتے ہیں تو ان کو دیکھ کے اللہ تعالیٰ کا یقین بحال ہوجاتا ہے اس بات کو تم اختصار کے ساتھ یوں سمجھ لو کہ جس وقت حضورؐ نے دعوت الی الحق شروع کی اور جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت قرآن شریف کی کتنی آیتیں تھیں کہ جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے اس وقت لوگ کس بات پر مسلمان ہوئے۔ اور اصل سرچشمہ اور منبع ایمان اور یقین کا وہی ہے جس پر اس وقت کے لوگ اسلام لائے تھے تو اس بات کو سمجھ لیں کہ عام طور سے حق کی جو معرفت ہوتی ہے وہ کسی شخص کے ذریعہ سے ہوتی ہے اس کو دیکھ کر یقین پیدا ہوتا ہے، پھر وہ شخص لوگوں کو علم دیتا چلا جاتا ہے۔

اس موقعہ پر ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے میں حدیثِ مفضل کی شانِ نزول کیطرف اشارہ کررہا ہوں یہ حدیثِ مفضل جیسا کہ آپ کو معلوم ہے بڑی اہم حدیث سمجھی جاتی ہے مفضل امام جعفر صادق علیہ السّلام کے شاگرد تھے تو انھوں نے یہ حدیث بیان کی ہے

اس کے بیان ہونے کی صورت جو بتائی جاتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مفضلؒ، مدینہ کی مسجد کے اندر بیٹھے ہوئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزارِ مبارک سامنے تھا اور اس میں دو معتزلہ حکماء، ایک استاد اور ایک شاگرد وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے اور چونکہ دینِ اسلام میں خیالات کی ایک حد کے اندر آزادی تھی تو پہلی صدی کے خاتمے تک آزاد خیالی کا دور شروع ہو گیا تھا اور معتزلہ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ چنانچہ وہ استاد اور شاگرد وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق بحث کر رہے تھے اور شاگرد نے فخریہ انداز میں اپنے استاد سے کہا کہ ہمارے پاس تو اتنی محکم دلیلیں ہیں کہ اب یہ عامۃ المسلمین اللہ تعالیٰ کے وجود کے اوپر کتنی ہی دلیلیں لائیں ہم ہر دلیل کو کاٹ سکتے ہیں اور پھر داد طلب نظروں سے اپنے استاد کی طرف دیکھنے لگا۔ استاد چونکہ سمجھدار تھے اس لئے وہ خاموش رہے اس بات کے اوپر یہ جو شاگرد تھا تو پھر اس نے کہا حضرت ہماری دلیلیں بھونڈی نہیں ہیں ہماری دلیلیں بڑی مضبوط اور بڑی محکم ہیں، اب دیکھیں تو سہی یہ عامۃ المسلمین کیا دلیلیں لاتے ہیں۔ کس طرح سے یہ دلیلوں سے اپنی بات ثابت کرتے ہیں جب وہ شاگرد زیادہ مُصر ہونے لگا تو استاد کہنے لگے کہ ہاں بھئی دلیلیں ہمارے پاس بہت مضبوط ہیں جو دلیلیں عامۃ المسلمین لائیں گے تو اس کا جواب بھی ہم دے سکتے ہیں لیکن (اور یہ بہت بڑی تھی) یہ کہہ کے حضورؐ کی آرام گاہ کی طرف اشارہ کر کے کہا، لیکن اس دلیل کا کیا جواب ہے اس دلیل کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تو اس طریقے سے سب سے بڑی دلیل اور سب سے بڑی اللہ تعالیٰ کی آیت وہ ضروری ہوتا ہے۔ کہ جس کا ہر بیان اور ہر فعل اللہ تعالیٰ کی شہادت بنتا ہے جس کا ہر لمحہ ایک شہادت ہے یہ گویا توحید کی معرفت کی بات ہوئی اب ایک نکتہ اور سمجھنا ہے اور وہ یہ کہ کسی ملت کے اندر وحدت جو قائم ہوتی ہے تو وہ اسی توحیدِ الٰہی کا پرتو ہوا کرتی ہے، وحدت توحید کا لازمی نتیجہ ہے، کلامِ پاک کا حکم یہ ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو فرقے فرقے مت بنو اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد رکھو، اور وہ نعمت کیا ہے وہ نعمت یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں

میں محبت ڈال دی اور تمھاری کیفیت تو ایسی تھی جیسے تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے ہو اس میں تم گرنے والے ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ روشن آیت اتاری (گویا ملت کے اندر اتحاد کا پیدا ہونا الفت کا پیدا ہونا محبت کا پیدا ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تاکہ تمھاری ہدایت ہو سکے ایک اور موقع پر اللہ تعالےٰ اپنے رسولؐ سے یہ فرماتا ہے کہ ہم نے تیری مدد کی اور بہت سے مومنین کے ذریعے سے مدد کی اور اے رسولؐ اگر تو ساری دنیا کے خزانے اور دولت دے دیتا تو بھی یہ بات نہ ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی اور بے شک اللہ تعالیٰ بڑا قوی اور عزیز ہے تو گو یا ملت میں جو اتحاد پیدا ہوتا ہے اس کی اساس یہ ہے کہ سب افراد ایک آقا کے فرمانبردار ہیں، ایک حاکم کے حکم کی اطاعت کرنے والے ہیں ۔ ایک مقصد ان کے سامنے ہے، جب یہ کیفیت ہو تو آپس میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے، ایک بات یاد رکھنے کی ہے اور وہ یہ کہ مفادات سے اتحاد پیدا نہیں ہوا کرتا اس لئے کہ مفاد تو خود غرضی پر منحصر ہوتے ہیں۔ ہر شخص کا مفاد دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور ان مختلف مفادات کے درمیان توازن قائم (BALANEE) قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔
اور سیاسی حکماء ایک طرح کا سیاسی توازن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کہ مفادات کی بنیاد پر حقیقی اور صحیح اتحاد پیدا ہو جائے تو یہ ناممکن ہے، اور اگر سب آپس میں مل کر کسی موقع پر دفاع جو کرتے ہیں تو وہ بھی اس وجہ سے کہ ہمارے سب کے مفادات کے اوپر چوٹ پڑ رہی ہے، یعنی جب ہر شخص کا مفاد خطرے میں ہو تو سب مل کر اس کا دفاع کرتے ہیں لیکن یہ بات کہ دلوں میں ہم آہنگی ہو تو وہ مقصد کی ہم آہنگی کے بغیر ممکن نہیں جس وقت کہ مقصد ایک ہوتا ہے، اگر وہ بلند ترین مقصد ہو، بلند ترین مقصد سے مطلب یہ ہے کہ جس کے لئے آدمی اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لئے تیار ہو، تو لوگوں کے اندر الفت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے ۔

عزیزو! اللہ تعالیٰ تمام انسانیت کا رب ہے، اس نے تمام کے تمام انسانوں کو خطاب کرتے کہا ہے کہ تم تو امتِ واحدہ ہو، تمھاری تو ایسی کیفیت ہے جیسی نفسِ واحدہ

کی ہوتی ہے تم تو امتِ واحدہ ہو۔ پھر آپس میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے
تو اختلافات جب پیدا ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجے بشارت دینے
والے رسول بھیجے، ڈرانے والے رسول بھیجے، ان کے ساتھ کتاب بھیجی اور وہ کتاب
اس لئے بھیجی کہ جن باتوں میں اختلاف تھا ان کا فیصلہ کرسکیں اور پھر کتاب کے آنے
کے بعد جس وقت کہ اس قوم کو کتاب مل گئی تو اس وقت لوگ اپنی بغی کی وجہ سے
اپنی غفلت کی وجہ سے اختلاف کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اس لئے نہیں بھیجے کہ
انسانوں کو مختلف فرقوں میں بانٹا جائے بلکہ انسانوں کو اتحاد کی طرف لے جانے کے لئے
ان کے اختلافات کو مٹانے کے لئے رسول آئے اور تم کلامِ پاک کے اندر دیکھو کہ
ہمارے رسولؐ اہلِ کتاب کو دعوت دیتے تھے کہ آؤ ہم اور تم اکٹھے ہو جائیں اس کلمے
اوپر جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا اور کسی کی
اطاعت نہیں کریں گے اور حکم اسی کا مانیں گے تو یہ تمام انسانوں کو توحید کے مرکز پر متحد
کرنے کی بات تھی پھر جہاں آپس میں اختلافات کا ذکر آیا ہے ہمیں یہ بات بھی بتائی
گئی ہے کہ شریعت اور منہاج تو سب کے سب علیحدہ ہوتے ہیں۔ تم نیکی کرنے میں ایک
دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو اور جو نیکی کرنے والا ہے اور جو اللہ پر اور آخرت
میں یقین رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عمل کی پوری پوری جزا دینے والا ہے، اور
اختلافات کی بابت ہمیں یہ بات بتائی گئی کہ اللہ تعالیٰ ہدایت ان کی کرتا ہے جو الامر
کو پکڑے رہیں، جو امرِ الٰہی کو اللہ کے امر کو پکڑے رہیں جو ان اصولوں کے اوپر اور
ان بنیادی حقیقتوں کے اوپر کہ جو تمام ادیان میں مشترک ہیں کاربند ہیں اور وہ کہ جو
اللہ کی ذات میں اپنی تمام امیدوں اور خوف کو مرکوز رکھیں اور جو فاستبقوا الخیرات
یعنی جو نیکی کرنے کے اندر آگے بڑھنے والے ہیں تو یہ معیار ہے ان لوگوں کا جن کی ہدایت
کی جاتی ہے ورنہ تو کیفیت یہ ہے کہ ایک گروہ ادھر ہو گیا، ایک گروہ ادھر ہو گیا، جو
جس گروہ میں شامل ہے وہ اسی گروہ کے اوپر نازاں ہے اور دوسرے گروہ سے لڑتا
پھر رہا ہے کہ میرا گروہ جو ہے وہ اچھا ہے اور دوسرا یہ کہہ رہا ہے کہ میرا گروہ اچھا ہے

اس طریقے سے اختلافات اور جھگڑے چلے جا رہے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ وقت بھی آئے گا کہ جب اللہ تعالیٰ ان تمام کا محاسبہ کرے گا۔

تو اتحاد قائم کرنے کے لئے ہمیں یہ نسخہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے امر کے اندر اختلاف مت کرو اور الامر کیا ہے الامر جو ہے تو وہ عدل ہے اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے، عدل کا اور احسان کا اور اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے اس بات کا کہ ہم ایتائے ذوی القربیٰ کرتے رہیں اپنے ذوی القربیٰ کے ساتھ نیکی اور مہربانی سے پیش آئیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے کہ فحشا اور منکر سے بچیں اور اس بات سے منع کرتا ہے کہ بغی کریں، اب بہت مختصر طور پر ہم عرض کریں کہ احسان عدل کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہوتی عدل یہ ہے کہ جو آپ کو کرنا ہے اگر آپ فرض شناس ہیں آپ کی طبیعت چاہے یا نہ چاہے جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے وہ آپ کو کرنا ہے جس وقت کھلے دل سے آپ تعمیلِ امر کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کرنے لگتے ہیں تو وہ احسان ہے لیکن یہ بات کہ آپ بغیر عدل کے احسان کرنے کی کوشش کرنے لگیں تو یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بغیر جڑ کے کسی درخت کو پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، ایتائے ذوی القربیٰ کے اندر یہ بات ہے کہ چونکہ ہمارے ایمان کے مطابق بیت یعنی گھر کو اور خاندان کو بڑی زبردست اہمیت دی گئی ہے تو یہ حکم اس لئے ہے کہ خاندان بندھے رہیں، یہ بات نہ ہو کہ اگر ایک بھائی کو ذرا زیادہ آمدنی ہو رہی ہے اور دوسرے بھائی کی ذرا کم آمدنی ہے تو وہ اس کو بھائی تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دے یہ نہ ہو کہ جیسے امیر المومنینؑ نے اپنے گورنر عثمان ابنِ حنیف کو لکھا تھا کہ تم اس دعوت کی کیفیت اگر دیکھنا چاہتے تھے جس کے قبول کرنے کے بعد تم معزول ہوئے تو تم تو اسی بات سے دیکھ سکتے تھے کہ غیروں کو تو بلایا گیا جو مالدار آدمی تھے اور ذرا حیثیت (STATUS) کے آدمی تھے ان کو تو بلایا گیا اور ان آدمیوں کو جو غریب تھے ان کو بھلا دیا گیا تو اگر تمہاری آنکھیں ہوتیں اور وہ آنکھیں تم نے بند نہ کر لی ہوتیں تو اس دعوت کا مقصد تو تمہارے وہیں سمجھ میں آ سکتا تھا کہ یہ دعوت کیوں ہو رہی ہے اور کیوں ایک گورنر کو اس میں بلایا جا رہا ہے تو گویا یہ ایتائے ذی القربیٰ

کی بات ہوئی اور منکر اور فحشا جو ہیں تو فحشا، تو وہ ظاہری برائیاں ہیں اور منکر اندرونی برائیاں ہیں جو تمام معاشرے کو خراب کر دیتی ہیں اور انسان کے نفس کو خراب کر دیتی ہیں منکر اور فحشا سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے معاشرے کو پاک صاف رکھو، ظاہر بھی اس کا حسین ہو اور اندر اور حقیقت کا چہرہ جو ہے تو وہ بھی حسین ہو، اپنے تعلقات میں نیکی سے کام لو، ایک دوسرے کی غیبت نہ کرتے پھرو ایک دوسرے کا مردہ گوشت نہ کھاتے پھرو، وہ باتیں مت کرو کہ جو معاشرے کو ترقی سے روکتی ہیں تو گویا حقیقت اور حسن دونوں کی قدریں تمھارے معاشرے کے اندر پیدا ہو جائیں اور دیکھو اللہ کے قانون سے بغاوت مت کرو تو گویا یہ الامر ہے یہ خدا کے امر کی مختصر توجیہ ہے۔

عزیزانِ گرامی! مختصراً میں اس بات کو عرض کرتا ہوں کہ دین کی تعلیمات کو دو درجوں (CATEGORIES) میں رکھ سکتے ہیں یا تو توحید ہے یا عدل ہے۔ میں اس سے قبل یہ عرض کر چکا ہوں کہ دینِ اسلام ایک حقیقت کو تسلیم کرنے کا نام ہے، ایک حکم کی اطاعت ہے اور ایک راستہ پر چلنا ہے۔ اب مختصراً میں آپ سے یہ بات عرض کروں کہ عدل حکم ہے اور توحید حقیقت ہے، دینِ اسلام ایک حقیقت کو تسلیم کرنا ہے اور ایک حکم کی اطاعت ہے۔ اب جب تم اپنے ائمہؑ کی زندگیوں کو دیکھو گے اور ان پر غور کرو گے تو ان کے اندر تم دو باتیں پاؤ گے اور وہ یہ کہ یا تو وحدتِ امت کی خاطر اپنے حقوق کو بھلا دیا جا رہا ہے یا تم یہ پاؤ گے کہ جس وقت کوئی اختلاف ہوا ہے تو وہ عدل قائم کرنے کی خاطر ہو رہا ہے، ان دو باتوں سے باہر تم کوئی بات نہیں پاؤ گے۔ جناب امیر المومنینؑ کی زندگی کا وہ حصہ دیکھو کہ جو حضورؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد پہلی تین خلافتوں کے زمانے میں رہا اس کے اندر تم یہ دیکھو گے کہ جتنی بھی کوشش ہو رہی ہے وہ وحدتِ امت کو قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، اس کی مثال میں یہ واقعہ دیکھیں کہ ابوسفیان امیر المومنینؑ کے پاس آئے اور انھوں نے یہ بات کہی کہ میں تمام مدینے کو گھوڑوں سے بھر دوں گا، تلواروں سے بھر دوں گا تم

اپنے حق کے متعلق کیوں خاموش بیٹھے ہوئے ہو۔ ابوسفیان کو جناب امیرالمومنینؑ کا جواب نہج البلاغہ کے اندر موجود ہے۔ یہ موقع نہیں کہ میں اس مختصر جواب کا تجزیہ پیش کروں ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ آپؑ نے حیرانی سے ابوسفیان کے چہرے کو دیکھ کر یہ فرمایا کہ اے ابوسفیان تم کب سے اسلام کے ہمدرد ہو گئے، ارے تمہارے دل میں یہ کیا درد اٹھا ہے تو یہ وہی وحدتِ امت کو قائم رکھنے کی بات ہے، اور اس موقع پر مجھے ایک اور تاریخی روایت یاد آتی ہے اور یہ تاریخی روایت یہ ہے کہ جناب سیدہؑ بیٹھی ہوئی ہیں اور جناب امیرالمومنینؑ بیٹھے ہیں اور جناب سیدہؑ یہ فرما رہی ہیں کہ ابوالحسنؑ تمہارا حق اس طرح سے مارا جا رہا ہے۔ عزیزو! ہم فی الحال اس پر بحث نہیں کر رہے ہے کہ خلافت واقعی کس کا حق تھا۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ جناب امیرالمومنینؑ اپنے آپ کو اس کا حقدار سمجھتے تھے اور اس بات کو کبھی چھپایا نہیں بلکہ اس کا بار بار اعادہ کیا تو جناب سیدہؑ یہ بات فرما رہی تھیں کہ ابوالحسنؑ تمہارا حق اس طرح سے مارا جا رہا ہے اور تم اتنے میدانوں کے مرد خیبر کے اندر تمہاری وہ شان تھی، بدر کے اندر تمہاری وہ شان تھی، کوئی لڑائی ایسی نہ تھی کہ جس کے اندر تم آگے آگے نہ تھے تو اب یہ کیا بات ہے اب اپنی تلوار تم نیام کے اندر کیوں کئے بیٹھے ہو تو یہ حقیقت کا ایک رخ تھا اس لئے کہ معصومہ ایک معصوم سے بات کر رہی تھیں، اور اس کے اندر بھی یہ بات ہے کہ حقیقت کے تمام رخ جو ہیں تو وہ نمایاں ہو جائیں، اب کیفیت یہ ہے کہ جناب سیدہؑ یہ فرمائے جا رہی ہیں اور جناب امیرالمومنینؑ خاموش سر جھکائے ہوئے یہ بات سنے جا رہے ہیں اور کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالتے کہ اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز آئی تو جس وقت کہ وہ آواز آئی تو امیرالمومنینؑ جناب سیدہؑ کی طرف مخاطب ہو کر بولے کہ بنتِ رسولؐ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ یہ آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے کیا تم یہ چاہتی ہو، یہ گویا جناب امیرالمومنینؑ کی حجت تھی۔ ایک معصوم نے دوسرے معصوم کے سامنے اپنی حجت پوری کی۔

عزیزانِ گرامی، ہم کوئی اختلافی بات، کوئی جھگڑے کی بات نہیں کرتے۔

لیکن تاریخ کا حقیقت پسندی سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ کسی معاشرے کی صرف تعریف کئے جائیں اور اس کی برائیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں، کیا تم اس کو صحیح سمجھتے ہو کہ اس عہد کو اپنا عہدِ زرّیں سمجھے چلے جاؤ کہ جس میں چار خلفاء میں سے تین کو اپنی طبعی موت بھی مرنا نصیب نہیں ہوا اس کو تم اسلام کا عہدِ زریں سمجھو، اور اگر کسی خرابی کی نشاندہی کی جائے تو اس کو عبداللہ بن سبا کے سر تھوپ دو اور تم دیکھو تو بھی اس میں تو خود ہماری ذلت ہے کیوں؟ وہ اس لئے کہ مومن جیسی فراست کے لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو، ایک یہودی نو مسلم یہودی وہ آکے تمام کو بہکاتا چلا گیا، سارے کے سارے مسلمان جو فراست میں بڑے مشہور ہیں وہ سب اس کے بہکائے میں آگئے تو تم اس معاشرے کے متعلق کیا محاکمہ کرتے ہو کہ جس میں ایک آدمی آکے تمام کے تمام کو بہکاتا چلا گیا سارے مسلمان جن میں بڑے بڑے صحابی تھے وہ سب کے سب اس کے اس کے بہکانے میں آگئے، تو یہ بات ایک مسلم مواشرے کے شایانِ شان نہیں ہے، اس سے اسلامی معاشرے کی کچھ اچھی تصویر نہیں بنتی، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ جیسے ہندوؤں کی داستانوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ جس وقت ہنومان لنکا پہنچے تو انھوں نے اپنی دُم میں آگ لگا لی اس درخت سے اچھلے اُس درخت پر پہنچے، اُس درخت سے اِس درخت پر پہنچے اور ساری لنکا کے اندر آگ لگ گئی تو یہ عبداللہ بن سبا اسی طرح سے ایک شہر سے دوسرے شہر میں جا کے ہر جگہ آگ لگاتا تھا اور وہ بافراست مومن جو ہیں وہ سب کے سب اسکے کہنے میں آجاتے تھے، یہ بات جو ہے تو یہ چلنے والی بات نہیں ہے۔ یہودیوں کی یہ عادت تھی کہ جب انھیں اپنی قوم کے گناہوں کا احساس ہوتا تھا تو ایک بکرے کو چُن لیتے تھے، اسے (ESCAPE GOAT) کہتے تھے (یہ لفظ اب بھی انگریزی میں محاورتاً استعمال ہوتا ہے اردو میں ہم اسے قربانی کا بکرا کہہ سکتے ہیں) اور اس بکرے کے اوپر اپنے سارے گناہ رکھ کے اس کو بیابان کی طرف نکال دیا کرتے تھے کہ یہ بکرا ہمارے سارے گناہ لے کر چلا گیا تو اس طریقے سے عبداللہ ابنِ سبا کو یا کسی اور آدمی کو ESCAPEGOAT

بنا کے اور تاریخ سے اپنی نگاہیں بند کر کے ساری خرابی اس پر مت لاد دیں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا بس ایک بات میں کہہ دوں کہ کچھ نہ کچھ تو اس معاشرے میں خرابی ضرور ہوئی تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کچھ نہ کچھ تو معاشرہ ضرور بدلا تھا اور اس تبدیلی کی ایک واضح نشانی حضرت ابوذرؓ ہی کا واقعہ ہے۔ ہم کچھ نہیں کہتے کہ قائد ایوان صاحبِ اسلام زیادہ جانتے تھے یا ابوذرؓ زیادہ جانتے تھے اس لئے کہ اس ضمن میں کچھ کہنا ہم ابوذرؓ کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، ایک نومسلم یہودی سے ابوذرؓ کا مقابلہ کرنا یہ حفظِ مراتب کو بھول جانا ہے، جیسے ہم کفر کے برابر سمجھتے ہیں۔ اس معاشرے کے متعلق کیا کہا جائے جس میں ایک نومسلم یہودی ابوذرؓ جیسے صحابی کے ساتھ بحث کرتا ہے، ان سے مقابلہ کرتا ہے، بڑی تکلیف دینے والی کہانی ہے ابوذرؓ کی وہ مدینہ کی گلیاں کہ جن میں ابوذرؓ حضورؐ کے زمانے میں محترم ہستی تھے اب وہ کسی وجہ سے خود مدینہ چھوڑ گئے ہوں یا انھیں نکال دیا گیا ہو، اس بات سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ اب مدینہ کی گلیاں بدل گئیں، اب ابوذرؓ مدینہ کے قابل نہیں رہے یا یہ کہ مدینہ ابوذرؓ کے قابل نہیں رہا، اب مدینہ میں اور ابوذرؓ میں ایک زبردست فرق پیدا ہو گیا ہے، اب مدینے کے معاشرے میں اور ابوذرؓ جیسے صحابی میں ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے، اب ایسے معاشرے میں امیر المومنینؑ کی تمام کوشش یہی تھی کہ وحدتِ اُمّت کسی طرح سے سلامت رہے، یہ اذان جو ہے تو قائم رہے اور جس وقت آپ خلافتِ ظاہری کے اوپر فائز ہوئے تو آپ کی جتنی بھی کوششیں تھیں تو وہ یہ کہ معاشرہ اپنے صحیح مرکز کی طرف جائے تاکہ اس میں حقیقی اور پائیدار وحدت قائم ہو سکے اس لئے کہ وحدت بامعنی اس وقت ہے جس وقت کہ وہ عدل کے اوپر قائم ہو ورنہ وحدتیں تو بہت ہوتی ہیں۔ بھیڑیوں میں بھی ایک وحدت قائم ہو جاتی ہے جس وقت کہ وہ شکار کے لئے جائیں اور اگر کوئی خوف کا موقع ہو تو بھیڑیں بھی ایک دوسرے کی دُم میں منہ دے کر کھڑی ہو جاتی ہیں لیکن یہ اسلامی وحدت نہیں ہے، اسلامی وحدت وہ ہے کہ جو عدل کے اوپر قائم ہو، عدل ہی کے ذریعے اسلامی وحدت قائم ہو سکتی ہے، اس لئے کہ

جس جگہ عدل نہیں ہے وہاں فساد ہے اور جس حد تک عدل نہیں ہے اسی حد تک فساد ہے۔ اس لحاظ سے جناب امیرالمومنینؑ کی زندگی کے دوسرے دور میں کوشش یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ جو اپنے مرکز سے ہٹ گیا ہے پھر صحیح مرکز کی طرف لوٹ آئے۔ معاشرہ جو عدل سے دور ہو گیا ہے تو وہ عدل کے اوپر قائم کر دیا جائے۔ عزیزو! یہ ہیں ابوالحسنین حسنؑ کے والد اور حسینؑ کے والد۔ ان کی زندگی کا ایک دور (PHASE) دیکھو اور ان کی زندگی کا دوسرا دور (PHASE) دیکھو اور اس کے بعد ان کے ایک بیٹے کا عمل دیکھ لو اور دوسرے بیٹے کا عمل دیکھ لو تو تمھاری سمجھ میں آجائے گا کہ ابوالحسنینؑ کی کیا شان ہے اور حسنؑ نے کیا کیا اور حسینؑ نے کیا کیا۔

اب امام حسنؑ تک آئے تو ان کے متعلق تاریخوں میں لکھنا شروع کیا کہ امام حسنؑ فطرتاً بڑے صلح پسند تھے، بڑے امن جو تھے۔ امام حسینؑ کا مزاج بالکل دوسرا تھا، عزیزو یہ منزل وہ نہیں ہے کہ جس میں اپنے مزاج کی متابعت کی جائے، یہ امرِ الٰہی کی اطاعت کی منزل ہے یہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جس وقت کہ آدمی اپنی خودی اور اپنی خواہشات کو پیچھے پھینک کے صرف مرضیِ الٰہی کا تابع ہوتا ہے اور پھر اللہ تعالےٰ اس کو بصیرت دیتا ہے وہ بصیرت جو معصوموں کو دی جاتی ہے جس کے ذریعے سے وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت کس بات کا محل ہے، ملت کے مفاد کا تقاضا کیا ہے۔ معصوم کا عمل اس کی اپنی خواہشات یا مزاج کا تابع نہیں ہوتا، بلکہ یہ وہ منزل ہے جہاں امت کی بھلائی کا سوال پیشِ نظر ہوتا ہے، اپنی خواہشات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اپنے مزاج کو اپنی خودی کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کے امر کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ جو تم مختلف الفاظ دیکھتے ہو مزاج ائمہؑ کے متعلق تو اس کے معنی مزاج کے اختلاف کے نہیں ہوتے۔ عزیزو! امامت کہ جو ناموسِ کبریٰ ہے یہ اس کی مختلف شانیں ہیں۔ کسی کے اندر کوئی شان جھلک رہی ہے کسی کے اندر کوئی شان جھلک رہی ہے تو یہ مختلف شانیں ہیں یہ اختلافات نہیں ہیں، اس لیے امام حسن علیہ السّلام کے لئے یہ بات کرنا کہ صلح ان کے مزاج کے مطابق اور جنگ ان کے مزاج کے خلاف تھی، ہم اس کو معصوم کی شان میں گستاخی سمجھتے ہیں۔

پھر امام حسنؑ کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ انھوں نے خلافت ترک کردی چونکہ وہ امن کی طرف راغب تھے حالانکہ ان کے پاس بہت سارے انصار تھے، دوسری روایت جو ہے تو وہ یہ چلتی ہے کہ جناب امام حسنؑ فرماتے ہیں کہ اگر میرے پاس چالیس آدمی ہوتے تو میں اس بات کو پسند نہیں کرتا اب ان دونوں کی تطبیق کرلو میں اس بات کو بھی سچ سمجھتا ہوں اور اُس بات کو بھی سچ سمجھتا ہوں واقعہ یہ ہے کہ اب ملّت کے اندر جہاد کی اسپرٹ ختم ہو گئی، اب پیسے سے خریدے ہوئے سپاہی موجود ہیں، اب کرائے کے آدمی تو بہت جمع کئے جاسکتے ہیں مگر جنھیں سچے مجاہد کہا جاسکے وہ بہت کم ہیں۔ کرائے کے آدمی جن کا پیشہ لڑنا ہو توان کی بات تو یہ ہے کہ جدھر پیسے زیادہ ملیں گے وہ اسی طرف چلے جائیں گے۔ اب کرائے کے آدمی جمع کرکے جنگ لڑنا منظور ہوتی تو ایسی بھیڑ تو واقعی امام حسنؑ بہت لگا سکتے تھے، لیکن امام حسن علیہ السّلام کے سامنے تو جن چالیس آدمیوں کا خیال تھا تو وہ چالیس آدمی وہ کرائے کے لڑنے والے نہیں تھے، انھیں تو ایسے افراد کی ضرورت تھی جن کے تعاون سے باطل کو للکارا جاسکتا تھا۔ شاید امام کی نگاہوں نے کچھ صورتیں دیکھ لی ہوں۔ ان چالیس آدمیوں کی کہ جو کربلا کے اندر بہتّر کی صورت میں نظر آنے والے تھے۔

عزیزو! ایک بڑے اہم نکتہ کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ جناب امام حسن علیہ السلام نے فرمایا کہ لوگو! میں نے وہ کیا جو خضرؑ نے موسیٰؑ کے ساتھ کیا تھا، اب اول تو آپ اس امام کی شان دیکھیں، امام کی یہی شان ہوتی ہے کہ جس بات کو اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ یہ سچ ہے اور صحیح ہے تو وہ اس پر کاربند ہوتا ہے۔ اور ملامت کرنے والو کی کوئی پرواہ نہیں کرتا ہے، امام حسن علیہ السلام کی زندگی کو دیکھو کہ اپنوں نے ملامت کی غیروں نے ملامت کی، میں تو حیران ہوں اس امام کے تحمل اور ظرف کی شان کو دیکھ کر۔ منبروں سے آپ کے والد بزرگوار کی برائیاں کی جارہی ہیں اور انسانی فطرت یہ ہے کہ اپنے باپ کی برائی کوئی نہیں سنا کرتا۔ خواہ وہ باپ کیسا ہی ہو اور پھر امام حسن علیہ السلام کے جیسا باپ، اور ہم نے کسی تاریخ کے اندر

یہ نہیں دیکھا کہ امام حسن علیہ السلام نے مسجد میں جانا چھوڑ دیا ہو، کسی تاریخ کے اندر یہ نہیں دیکھا کہ کوئی وقت ایسا آیا ہو کہ امام حسن علیہ السلام نے یہ بات کہی ہو کہ مسجد میں تو منبروں کے اوپر میرے والد کی مذمت کی جاتی ہے اس لئے میں گھر کے اندر ہی نماز پڑھ لیا کروں گا۔ اور اب اگر تم یہ بات کہو کہ تاریخ کے اندر یہ بات بھی تو نہیں آئی ہے کہ وہ مسجد کے اندر جا کے نماز پڑھتے تھے تو آپ سے یہ بات عرض کرتا ہوں کہ رسمی اور معمول کے مطابق جو بات ہوتی ہے تاریخ اس کو نہیں لکھا کرتی، جو کوئی صاحب کبھی کبھی نماز پڑھیں صرف عیدین کی نماز پڑھیں تو وہ خبر اور فوٹو اخبار کے اندر آ جاتا ہے کہ فلاں صاحب نے عید کی نماز پڑھی اور جو شخص پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے تو اس کے لئے تاریخ یہ نہیں لکھے گی۔ ہاں اگر امام حسن علیہ السلام اس بات کو ترک کر دیتے، مسجد جانا چھوڑ دیتے تو وہ بات واقعی ایسی تھی کہ ہر تاریخ میں ملتی تو اس بات کو آپ سوچیں اور امامت کے ظرف کو آپ دیکھیں تو یہ امام حسن علیہ السلام کے ظرف کی شان تھی، اور آپ نے فرمایا کہ لوگو! جو کچھ میں نے کیا ہے اس سے بہتر تو کوئی بات دنیا کے اندر ہوئی ہی نہیں اور پھر انھوں نے قرآن شریف کی ان آیتوں کی طرف اشارہ کیا کہ جس میں جناب موسیٰؑ کا وہ واقعہ ہے کہ آپ گئے ہیں ایک شخص کے پاس، اس شخص کا نام خضرؑ سمجھ لو حالانکہ کلامِ پاک کے اندر نام نہیں ہے تو جناب موسیٰؑ خضرؑ کے پاس پہنچے، خضرؑ نے ایک کشتی توڑ دی اور ایک دیوار کھڑی کر دی اور ایک بچے کو قتل کر دیا اور جناب موسیٰؑ اس بات کو نہیں سمجھے مگر یہ تمام کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تھیں اور جناب امام حسن علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے اس وقت وہی کیا ہے جو اُس وقت خضرؑ نے کیا تھا اور اب اس بات کو آپ سوچیں کہ اگر وہ حالات اسی طریقے سے چلتے چلے جاتے تو نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلام خانہ جنگی کا شکار ہو کر رہ جاتا۔ اب اسلام کی تصویر کچھ اس طرح ہوتی کہ جو حکومت کے دعویدار تھے تو ان کی آپس میں لڑائی تھی اور جو جہاد کی حقیقی روح تھی وہ معاشرے سے ختم ہو گئی تھی، ہاں ہم بھی یہ بات کہتے

ہیں کہ کشتی کے اندر ایک تختہ ٹوٹا جس طریقے سے کہ خضرؑ نے اس کشتی کے ایک تختے کو توڑا مگر اس سے اتنی بات ضرور ہو گئی کہ اس کشتی کے اوپر ظالموں کا قبضہ نہیں ہوا ہم غریبوں کا یہ آسرا جس کا نام دینِ اسلام ہے اس کے اندر ایک نقص تو پیدا ہو گیا کہ امام حسنؑ کی موجودگی میں ایک دوسرا آدمی حکومت کا سربراہ ہے، یہ نقص تو پیدا ہو گیا مگر وہ کشتی بچ گئی۔ ہم غریب ملّاح اس کشتی سے روزی کما سکتے ہیں، اپنا رزق حاصل کر سکتے ہیں ورنہ وہ کشتی ظالم بادشاہ کے قبضے میں جا رہی تھی۔ اور خضر نے یہ کیا کہ کچھ حقدار تھے تو ان تک ان کے حق کو پہنچانا تھا۔ خضرؑ نے وہ دیوار جو گر رہی تھی تو اس کو کھڑا کر دیا۔

عزیزو! امام حسن علیہ السلام نے اس فتنے کے اوپر دیوار کھڑی تاکہ جو واقعی اسلام کے ورثہ دار ہیں ان تک حق پہنچ سکے، اگر یہ نہ ہوتا تو کربلا تک بات نہیں پہنچ سکتی تھی اور وہ جو حق تھا اور وہ جو اسلام کا ورثہ تھا وہ اس کے حقیقی وارث تک نہ پہنچ سکتا۔ اور پھر دیکھیے کہ اسلام میں دو روایتیں چلی ہیں۔ ایک روایت تقویٰ کی چلی اور ایک روایت ملک اور عصبیت کی چلی، یہ دو روایتیں جو ہیں تو وہ چلیں تو اب کیفیت کیا تھی، کیفیت یہ تھی کہ یہ ملک اور عصبیت کی جو روایت تھی تو یہ اسلام کی ورثہ دار بن گئی اور یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہی ملک اور عصبیت جو ہے تو یہ اسلام کی روایت ہے اور تقویٰ والی روایت جو تھی تو وہ کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ہماری جانیں قربان ہوں امام حسن علیہ السلام پر کہ آپ نے اس روایت کو، ملک اور عصبیت کی روایت کو ختم کر دیا۔ جس طریقے سے ایک مومن کا نافرمان بیٹا تھا تو خضرؑ نے اس کو قتل کر دیا تھا تو اسی طریقے سے امام حسنؑ نے ملک و عصبیت کے فتنہ کو ختم کیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا نعم البدل کربلا کے اندر دیا کہ واقعی حقیقی ورثہ دار جو ہیں اسلام کے وہ یہی ہیں، اب ان باتوں کو یاد کرو کہ جناب امام حسن علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے وہ کیا کہ جو خضرؑ نے کیا تھا اور خضرؑ نے کشتی توڑی تھی، خضرؑ نے ایک لڑکے کو قتل کیا تھا اور خضرؑ نے ایک دیوار کھڑی کی تھی تو آپ نے بھی وہی کیا ہے اسلام کے ساتھ اور اس سے بہتر بات اور کوئی نہیں تو گویا امام حسن علیہ السلام کے عمل میں جو گہرائیاں پوشیدہ تھیں اس کی

معرفت خود آپ کے ارشاد کی روشنی میں اس تمثیل سے حاصل ہو سکتی ہے جو جناب موسیٰؑ اور جناب خضرؑ کے واقعہ میں ملتی ہے اور اب اس کے بعد کربلا جو تھی تو وہ ممکن ہو گئی اس لئے کہ صلح حدیبیہ کے بعد بہت سارے لوگ جوق در جوق اسلام کے اندر داخل ہوئے، اس کے بعد فتح مکہ ہوتی ہے۔ عزیزو! کربلا ایک دوسرا جہاد ہے اور یہ جہاد جو ہے تو یہ وہ جہاد ہے کہ جس کے اندر مظلومیت کو ایک فعال طاقت کے طور پر استعمال کیا جائے گا جس درجہ تک مظلومیت بڑھے گی اسی درجہ تک اس میں فعالیت زیادہ پیدا ہو گی اور اسی درجہ تک اس کے اندر تاثیر زیادہ بڑھے گی۔ جہاد کی ایک منزل وہ ہے جہاں جہاد کے لئے راہِ خدا میں اسباب مہیا کیا جاتا ہے۔ مگر کربلا وہ منزل ہے کہ جس کے اندر جہاد کا رخ اللہ کی طرف موڑا جا رہا ہے۔ مسبب الاسباب کی طرف موڑا جا رہا ہے اور ترکِ سبب جتنا بھی ہو سکتا ہے تو وہ ترکِ سبب کیا جا رہا ہے۔ یہ منزل جو ہے تو یہ دوسرے قسم کا جہاد ہے، یہ امام حسین علیہ السلام کا وہ جہاد ہے کہ اگر واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو خدا جانتا ہے کہ آپ اور ہم ملک کے معنی ہی نہ سمجھتے عزت کے معنی نہ سمجھتے، فتح کے معنی نہ سمجھتے، جہاد کے معنی نہ سمجھتے امام حسین علیہ السلام کے ایک عمل نے ان تمام باتوں کی تفسیر کر دی اس جہاد کی ضرورت یہ تھی کہ جو اس جہاد کا سردار ہے تو وہ خود اپنی زندگی کے اندر دعوت الی اللہ بن جائے۔ اسکی گفتگو سے، اس کے بیان سے، اس کے عمل سے لوگ یہ سمجھیں کہ یہ شہادت دے رہا ہے اپنی زندگی کے ہر لمحہ کے اندر شہادت دے رہا ہے۔ عزیزو! یہ شہادت جو تھی، یہ ایک واقعہ یا سانحہ کربلا تک محدود نہیں ہے۔ ان بزرگوں کی تو تمام کی تمام زندگی ایک شہادت ہے وہ جو کربلا کے اندر موت آئی۔ تو وہ تو اس زندگی کے سر پر ایک تاج رکھنا تھا، وہ تو زندگی کو ایک بلند معنی تک پہنچانا تھا، امام حسینؑ کی زندگی تو ایک مسلسل شہادت ہے، اور اس شہادت کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی معیت اور اس کی نصرت کا کرشمہ دیکھنا ہے تو وہ تم اس وقت دیکھو کہ جس وقت اور کوئی نصرت کرنے والا نہیں چنانچہ امام حسینؑ نے جب سب کو رخصت کرنا چاہا اور اپنی بیعت کا قلادہ سب کی گردن سے ہٹایا تو یہ یقین تھا جو اللہ نے انکو دیا تھا

اور وہ یہ کہ جس طرح اللہ بندے کے لئے کافی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس شہادت کے لئے تنہا حسینؑ کافی ہے، اب جو کوئی شریک ہوتا ہے تو وہ اس وجہ سے نہیں شریک کیا جارہا ہے کہ اس کی ضرورت ہے وہ اس لئے شریک ہوتا ہے کہ اپنے لئے سعادت حاصل کرے تو جو سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ شریک ہو اس جہاد میں، اس شہادت میں شریک بنے ورنہ حسینؑ کو کسی کو شریک کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تو یہ ترکِ سبب کی منزل ہے۔ اور ترکِ سبب کی ابتدار تو اسی وقت ہوگئی تھی جب امام حسینؑ نے بیعت سے انکار کر دیا تھا، حکومت اور اس کے ظلم کو آپ دیکھیں، اس وقت کے حالات پر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ جو انکارِ بیعت ہے یہ اسی بھروسے پر تو تھا۔ اور یہ اسی توکل کے اوپر تھا کہ ظاہری اسباب کی طرف سے اپنی نگاہیں موڑلی ہیں اور حسینؑ صرف مسبب الاسباب کی طرف دیکھ رہے ہیں اب اللہ تعالیٰ جو بھی نتیجہ پیدا کرنا چاہے تو اس پر حسینؑ راضی ہیں اور اسی طرح سے اسباب کی کمی ہوتی چلی جارہی ہے، یعنی لوگ جو ساتھ آرہے ہیں تو ان کو رخصت کیا جارہا ہے، ہر منزل سے رخصت کیا جارہا ہے۔ عزیزو! اللہ تعالیٰ کی نصرت کا اور اللہ تعالیٰ کی معیت کا تماشا تم اسی وقت تو دیکھو گے کہ جب اللہ کا بندہ بالکل اکیلا رہ جائے، جب تمام دنیا ایک طرف ہو جائے اور اللہ کا ایک بندہ جو ہے تو وہ اکیلا رہ جائے، اس وقت تم دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا معنی ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی معیت کے کیا معنی ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نصرت کے کیا معنی ہوتے ہیں تو گویا اب اس بات کو اس طرح سے سمجھیں کہ یہ ظلم اگر اپنی انتہا کو نہ پہنچ چکا ہوتا اور اگر امام حسین علیہ السلام اس طرح سے یکہ و تنہا نہ رہ جاتے تو یہ سب حقیقتیں کیسے اجاگر ہوتیں اور جس طرح سے صلح حدیبیہ کے بغیر فتحِ مکہ سمجھ میں نہیں آتی عزیزانِ گرامی اسی طرح سے اس صلحِ حسنؑ کے بغیر واقعۂ کربلا سمجھ میں نہیں آتا۔

دسویں مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

تمام حمد اس اللہ کو جو حی و قیوم ہے، ہم کچھ بھی نہ تھے وہ عدم سے ہمیں وجود کے اندر لایا، لاشے کو اس نے زندہ کیا پھر وہ ہمیں مارے گا، پھر وہ ہمیں زندہ کرے گا اور اسی کی طرف بازگشت ہے، وہ اللہ سمیع و بصیر بھی ہے، ہم جس حالت میں بھی ہوں وہ ہمارے ساتھ ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، ایک عمومیت کے ساتھ رفیق جو اس کے نافرمان بندے ہیں ان کے عمل کا حساب گنتے رہا ہے، جو اس کے فرمانبردار بندے ہیں ان کے لئے وہ رفیقِ اعلیٰ ہے، ان کی تنہائی کا مونس ہے، وہ رگِ جاں سے نزدیک تر ہے اور وہ نہ صرف ہماری تنہائیوں کا مونس ہے نہ صرف ہماری زندگی کے اندر رفیقِ اعلیٰ ہے اور رفیقِ صادق ہے اس لئے کہ زندگی میں ایک اللہ کے سوا سچا رفیق کوئی نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے معاملات کے اندر بھی شریک ہے، جس حالت میں بھی تم ہو تو وہ تمھارے ساتھ ہے اور وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کیا عمل کر رہے ہو، اور یاد رکھو کہ اگر تم دو ہو تو میرا وہ ہے یعنی تم یہ مت سمجھنا کہ اگر تم کوئی عہد یا کوئی معاہدہ کر رہے ہو تو اس کے اندر بس شریک وہ ہیں کہ جن سے معاہدہ کیا جا رہا ہے یا جو معاہدہ کر رہا ہے ، بلکہ ——— ایک شریک اللہ ہے، انسان کا انسان سے کوئی تعلق ایسا نہیں ہے کہ جس کے اندر تیسرا شریک اور شریکِ غالب اللہ تعالیٰ نہ ہو۔ تمھاری محبتیں، تمھاری عداوتیں، تمھاری دوستیاں، تمھاری دشمنیاں، تمھارے معاملات اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کے اندر شریکِ حال اللہ تعالیٰ ہے تو وہ کہتا ہے کہ تم دو ہو تو میرا وہ ہے، تم تین ہو تو چوتھا وہ ہے، اسی طریقے سے تعداد بڑھتا تا چلا جا رہا ہے تا کہ ہم اس کی موجودگی کا شعور اپنے دل کے اندر کریں اور جس وقت کہ حالتِ اضطرار کے اندر پکارا جاتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے اور وہ کیفیت کہ جو بے کسی اور بے بسی کی کیفیت ہے تو وہ اس کو دور کرتا ہے، بیشک انسان کی مدد کرنے والا اس کا غم خوار

سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں اور میں دُرود بھیجتا ہوں محمدؐ مصطفےٰؐ پر وہ کہ جس نے انسان کو وہ بھولا ہوا عہد یاد دلایا کہ جو اس نے اللہ سے کیا تھا وہ کہ جس نے عبد اور معبود کا ٹوٹا ہوا رشتہ بندے اور خدا کے درمیان جوڑا، اس کو مضبوط کیا، بیشک سچا خدا وہی ہے کہ جو خدائے محمدؐ ہے۔ سچی کتاب وہی ہے کہ جو محمدؐ کے اوپر نازل ہوئی ہے اور وہ تمام کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور وہ تمام کتابوں کی نگہبان ہے، تمام کا تمام جو کچھ ان سابقہ کتابوں میں ہے ان کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے سچی کتاب وہی قرآن ہے اور اللہ تعالیٰ کا سچا امر اور حکم وہی ہے کہ جو محمدؐ مصطفےٰؐ کے ذریعے سے ملا، باقی سب باطل ہیں، باقی سب واہمہ ہیں، باقی سب ہمارے دماغ کے تراشیدہ بُت ہیں اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور اگر ہم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کی محبت کے دعویدار ہیں تو اس کا لازمی اور فطری تقاضا یہ ہے کہ ہم اتباع کریں محمدؐ مصطفےٰؐ کا اس لئے کہ اس اتباع کے بعد کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جس سے ہم محبت کرنا چاہتے تھے یعنی اللہ تعالیٰ، وہ ہم سے محبت کرنے لگتا ہے، اور میرا سلام ان ائمۂ ہدیٰ پر کہ جنھوں نے رسولؐ کے اتباع سے رسولؐ کی معیت کا وہ درجہ حاصل کیا جو منیت کا درجہ ہے، جس میں تمام فرق جو ہیں تو وہ مٹ جاتے ہیں اور تب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارا اوّل بھی محمدؐ ہے ہمارا آخر بھی محمدؐ ہے، ہمارا اوسط بھی محمدؐ ہے اور ہم کُل محمدؐ ہیں۔ اللہ اور اس کے ملائکہ پر دُرود بھیجتے ہیں نبیؐ پر اے ایمان لانے والو تم بھی دُرود بھیجو، اور ایک بشارت، ایک خوش خبری اور اس کے ساتھ یہ کہ جس وقت یہ ایمان کا تعلق قائم ہو جاتا ہے تو اللہ اور ملائکہ دُرود بھیجتے ہیں مومنوں کے اوپر تاکہ ان کو ظلمت سے نور کی طرف نکالا جائے اور بیشک اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لئے بڑا رحیم ہے گویا یہ مودّت کا، رحمت کا اور مغفرت کا ایک دائرہ پورا ہو جاتا ہے، یہ دائرہ اللہ سے شروع ہوتا ہے، اللہ کے رسولؐ تک جاتا ہے، اللہ کی رحمتیں اور اللہ کا دُرود محمدؐ مصطفےٰؐ کے اوپر نازل ہوتا ہے۔ ہم مودّت کا رشتہ جب محمدؐ مصطفےٰؐ سے جوڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ہمارے اوپر دُرود و رحمت نازل ہوتے ہیں اور یوں یہ دائرہ پورا

ہوجاتا ہے محبت کا، وِلا کا اور سلامتی کا یہ دائرہ پورا ہوجاتا ہے۔

عزیزانِ گرامی! یہ موجودہ سلسلۂ تقاریر کی آخری تقریر ہے۔ ہم نے اس سلسلۂ تقاریر کا کوئی عنوان نہیں رکھا وہ اس وجہ سے کہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا عنوان رکھا جائے بانیٔ مجلس اس سلسلے میں بہت مُصر بھی رہے کہ کوئی عنوان ہونا چاہیئے۔ سب لوگ کسی عنوان کے تحت تقریریں کرتے ہیں۔ کچھ طریقہ بھی یہ چل گیا ہے۔ مرثیوں کے بھی عنوان ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے زمانے کا مزاج جو ہے تو اس کے لئے ایک مثال ہے ورنہ میرانیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے اپنے کسی مرثیے کا عنوان نہیں رکھا سوائے اس کے کہ یہ مرثیہ ہے۔ بہرحال میں اس کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں جو اس زمانے کا مزاج بن گیا ہے، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا عنوان رکھوں، صرف ایک بات سمجھ میں آتی تھی کہ ذکرِ حسینؑ کرنا ہے اور اس ذکر کے حوالے سے کچھ ہدایت طلب کرنی ہے، اور پھر ہم یہ سمجھے کہ بہتر بات یہی ہوتی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے ایک قدم آگے کی ہدایت طلب کرے۔ ادھر ایک قدم آگے کی ہدایت طلب کرتا ہے تو وہ دوسرا قدم بھی دکھا دیتا ہے، دوسرے کے بعد تیسرا قدم بھی دکھا دیتا ہے اور اس طرح سے سفر طے ہوجاتا ہے بشرطیکہ جس آدمی نے اپنی کوئی منزل مقرر نہیں کی لیکن اپنی سمت ٹھیک رکھی تو وہ صحیح منزل پر پہنچ گیا، مناسب ہے کہ آج ہم ذرا پیچھے نظر ڈال کے اور خلاصہ کے طور کے اوپر دیکھیں کہ ہم نے کیا سفر اختیار کیا، اس ذکر میں ہم نے کتنا راستہ طے کیا تاکہ وہ ہمارے ذہنوں میں محفوظ رہے۔ عزیزانِ گرامی! ہم نے ذکر کے معنی سمجھنے کی کوشش کی اور ہم یہ بات سمجھے کہ ذکر کے اندر دو باتیں ہوتی ہیں، ایک تو حقیقت کا اظہار ہوتا ہے اور ایک موعظت کا پہلو ہوتا ہے، حقیقت کے اظہار سے شعور بیدار کیا جاتا ہے اور اس سے جو موعظت اور نصیحت ہوتی ہے تو اس کا عمل اور زندگی کے اوپر اثر مرتب ہوتا ہے گویا یہ دو باتیں ذکر کے اندر ہوتی ہیں اور پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس ذکر کی روایت میں ذکرِ حسینؑ کس طرح شامل ہوا اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس ذکر کے کیا آداب ہیں اور کیا شرائط ہیں اور کس طریقے سے ہم حتی الامکان ان آداب و شرائط کو پورا کرسکتے ہیں۔

لیکن ہمارے اوپر یہ واجب ہے کہ جب ہم ذکرِ حسینؑ کرنے کی جرأت کریں تو ان آداب و شرائط کو سامنے رکھیں پھر ہم نے حضور محمد مصطفیٰؐ کے اس خطبے کو سمجھنے کی کوشش کی کہ جو آپ نے مقامِ منیٰ کے اندر اپنی زندگی کا آخری خطبہ دیا۔ یہ خطبہ آخری ہے یا آخری سے ایک پہلے، اس لئے کہ ایک خطاب غدیر کے میدان میں ہوا اور ایک منیٰ کے میدان میں ہوا تو وہ خطبہ ہم نے سمجھا، اپنی ہدایت کے لئے منبر کے جو صحیح وارث یعنی نبیؐ اور امامؑ ہیں ہیں تو ہم نے منبر سے ان کی کچھ آوازیں سننے کی کوشش کی اور ہم نے دیکھا کہ کس طرح اللہ کے رسولؐ نے ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری ہدایت کی، اپنی وصیت کے طور پر وہ کلمات دنیا کے لئے چھوڑے جنھیں تاریخ نے ثبت کر لیا، اور اس کے بعد ہم نے یہ دیکھا کہ وہ خطبے کہ جو امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا کے اندر ارشاد فرمائے تو یہ گویا حضورؐ کے اسی خطبے کی ایک گونج ہے جو میدانِ کربلا میں مختلف جگہوں سے آرہی ہے، جو باتیں مقامِ منیٰ کے اندر سنی تھیں تو بدلے ہوئے حالات کے اندر وہی تعلیم اور اسی آواز کی گونج ہم نے میدانِ کربلا کے اندر سنی، پھر اسی منبر سے جو ذکر ہوا اور جو نصیحتیں ہوئیں اور موعظت ہوئی تو ہمارے سامنے وہ تصویر آئی کہ جس وقت ظالم و جابر بادشاہ حکومت کر رہے ہوں تو اس وقت حرفِ حق کیسے بلند کیا جاتا ہے، ہمارے سامنے یہ تصویر آئی کہ لوگ تماشے کے لئے اکٹھے ہو رہے ہیں مگر حق کا اعلان کیا جا رہا ہے، اونٹ کی پشت سے، بازاروں کے اندر اور درباروں میں اللہ کے ذکر کو بلند کیا جا رہا ہے، لوگوں کی آنکھیں کھولی جا رہی ہیں کہ دیکھو اچھی طرح سے سمجھ لو کہ ملک کس کو کہتے ہیں، عزّت کس کو کہتے ہیں، فتح کس کو کہتے ہیں، مصیبت کس کو کہتے ہیں، اللہ کا غضب کیا ہوتا ہے، اللہ کا کرم کیا ہوتا ہے تو یہ تمام کی تمام حقیقتیں لوگوں کے سامنے بیان کی جا رہی ہیں اور وہ لوگ کہ جن کی آنکھیں چندھیا چکی ہیں، ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کے، ظاہری اقتدار کو دیکھ کے تو ان کی آنکھیں کھولی جا رہی ہیں کہ حقیقت کو بطورِ حقیقت اچھی طرح سے دیکھ لو، کیا کہنے ہیں ان خطبوں کی اثر انگیزی کے، اس لئے کہ وہ خطبے عجیب مواقع پر دیئے گئے تھے اور عجیب لوگوں نے دیئے تھے اور وہ خطبہ کہ جو پشتِ شتر سے دیا گیا، وہ خطبہ جو دربار کے

اندر کھڑے ہو کر دیا گیا، وہ خطبہ جو اس وقت دیا گیا کہ جس وقت منبر کے اوپر بیٹھ کر ایک شخص لغو باتیں کر رہا تھا تو ہم نے ان خطبوں کو سمجھا اور ان سے ہدایت حاصل کی اور یہ سمجھا کہ ملک کس کا نام ہے، عزّت کس کو کہتے ہیں، خیر کے کیا معنی ہیں، فتح کس چیز کو کہتے ہیں، مصیبتیں کس کس طرح آتی ہیں، کونسی مصیبت اللہ کی رحمت ہوتی ہے، کون سی مصیبتیں اللہ کے عذاب کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ یہ تمام کی تمام باتیں ہماری آنکھوں کے اوپر سے پردے اٹھا گئیں، اللہ کا شکر کہ اس نے ہمارے لئے ایسے ہادی بنائے جو اس طرح سے ہدایت کو واضح کرتے چلے گئے۔

پھر عزیزانِ گرامی! ہم نے یہ دیکھا کہ کلامِ پاک اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے تو اس کے اندر کتنے مضامین ہیں ان مضامین کو سطحی نظر سے ہم نے تقسیم کیا، اس کے اندر ایک مضمون یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ ایام اللہ بیان کر کے دنیا کے اندر جو واقعات و حوادث ہوتے ہیں، دنیا کے اندر جو قوموں کے عروج و زوال ہوتے ہیں تو ان کے واقعات بیان کر کے ہماری آنکھیں کھولنا چاہتا ہے، اس لئے کہ یہ کوئی لغو حدیث نہیں ہے، یہ افسانے نہیں ہیں بلکہ یہ ذکر موعظت کے لئے ہے، یہ کلامِ پاک کی آیتیں ہیں، ان میں نصیحت و موعظت ہے، یہ وہ تاریخ ہے جسے کلامِ پاک نے بیان کیا۔ اس میں قوموں کے عروج و زوال کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ کلامِ پاک کے اندر عقیدے اور ایمان کا ذکر ہے ہم نے یہ دیکھا کلامِ پاک کے اندر احکام کا حصّہ ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ کلامِ پاک کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا ذکر کر کے ہماری موعظت کر رہا ہے، ہماری تذکیر کر رہا ہے ہمیں قیامت کو یاد دلا کے اور موت کا ذکر کر کے ہماری تذکیر کر رہا ہے اور زمانے کے جو واقعات ہوتے ہیں اور حوادث ہوتے ہیں۔ گردشِ زمانہ جن کو کہا جاتا ہے، قوموں کے عروج و زوال جن کو کہا جاتا ہے ان کا ذکر کر کے ہماری نصیحت کر رہا ہے، ہماری موعظت کر رہا ہے، کچھ حقیقتیں ہمیں سمجھا رہا ہے اور ان حقیقتوں کے اندر ایک حقیقت کو ہم نے دیکھا اور اس کو سمجھا، اس کو اپنے قلوب کے اندر محفوظ کیا، وہ یہ حقیقت تھی کہ کسی واقعے کی اہمیت کسی دھوم دھڑکے سے اور ظاہری شان اور تجمّل سے نہیں ہوا کرتی، یہ بات نہیں کہ

جس واقعے کے اندر بہت سارے لشکر ہوتے ہیں، ملک فتح ہوتے ہیں تو ان کے اندر بڑی معنویت ہے یا ان کی بڑی اہمیت ہے، اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ تاریخ جس بات کو یہ کہتی ہے کہ یہ بہت بڑا انقلاب آگیا، بنی امیہ جو تھے تو ان کی حکومت ختم ہوگئی اور بنی عباس کی حکومت قائم ہوگئی تو اس کے متعلق ایک تاریخ کو جاننے والا اور حقیقتوں کا جاننے والا یہ بات سمجھتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی نظر میں اس واقعہ کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں کہ ایک فتنے نے دوسرے فتنے کی جگہ لے لی تو جب ہم نے کلام پاک سے ہدایت طلب کی تو ہم نے یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ خاص طور سے جو زور دیتا ہے تو وہ اس بات کے اوپر زور دیتا ہے کہ اگر تم کسی واقعہ کی اہمیت کو سمجھنا چاہتے ہو، اس کی معنویت کو سمجھنا چاہتے ہو تو ظاہر اشان وشوکت کو مت دیکھو بلکہ تم اس بات کو دیکھو کہ ظلم کی طرف کون ہے اور عدل کی طرف کون ہے، تم اس بات کو دیکھو کہ اللہ کی نصرت کون کر رہا ہے۔ اس لئے کہ جو اللہ کی نصرت کرتا ہے اللہ اس کی نصرت کرتا ہے، اللہ کو بھی نصرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ تو بندوں کی تلاش میں ہے، کدھر ہیں میری نصرت کرنے والے بندے، تو جو اللہ کی نصرت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نصرت کیا کرتا ہے، وہ ایک واقعہ کربلا کا واقعہ جسے اگر دنیاوی پیمانوں سے دیکھا جائے تو بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ہو، اس کے اندر وقت دو تین گھنٹے، پانچ چھ گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ دس گھنٹے لگ گیا ہو، اس کے اندر آدمیوں کی تعداد بہتر یا سو سے زیادہ نہ ہو مگر اکثر ایسے واقعات قلوب واذہان کو بدل دیا کرتے ہیں، اکثر وہ ایمان کا حصہ بن جاتے ہیں، تاریخ کا ایک حصہ بن جاتے ہیں، پوری ملت کے اندر ایک ایسی روایت قائم کر دیتے ہیں کہ جس روایت کو اگر نکال دیا جائے تو پھر تمام ملت کی تاریخ ایک افسانے سے ، زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، ہم نے اس بات کو دیکھا پھر ہم نے دیکھا کہ بنی اسرائیل کا جو ذکر کیا گیا ہے تو اس بنی اسرائیل کے ذکر میں کیا کیا باتیں بتائی گئی ہیں۔ اس ذکر کے اندر کن کن باتوں کو اللہ تعالیٰ نے اہمیت دی ہے اور ہم نے یہ دیکھا کہ اکثر اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کو اہمیت دی ہے کہ جن کی بظاہر سیاسی نگاہوں میں کوئی اہمیت نظر نہیں آتی وہ یہ کہ تم ایک کلمہ پڑھتے

ہوئے شہر کے اندر داخل ہو جاؤ، مگر لوگوں نے اس کلمے کو بدل کے دوسرا کلمہ کر دیا تو اس قسم کی باتیں کلامِ پاک میں اہمیت رکھنے والی آیات بن گئیں اور پھر ہم نے یہ بات دیکھی کہ اللہ تعالیٰ کون کون سی برائیوں کو بتا رہا ہے جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کے اوپر اللہ کا غضب نازل ہوا ان تمام باتوں کو اکٹھا کر کے تلاش کرنا شروع کیا اور جس وقت کہ ہم نے ان کو تلاش کرنا شروع کیا اور اپنے گریبان میں منہ ڈالنا شروع کیا تو ہم نے یہ دیکھا کہ وہ تمام کی تمام برائیاں تو خود ہمارے اندر بھی موجود ہیں، یہ بھی ہے کہ کتابِ خدا کے ایک حصے کو مانو اور ایک حصّے کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دو اور یہ بھی ہے کہ قرآن شریف کی اپنے ظن اور اپنی خواہشات کے لحاظ سے تفسیر کرو، یہ بھی ہے کہ کتاب تک اس لئے مت پہنچو کہ تم کو اس سے وہ ہدایت حاصل کرنا ہے جو کلامِ پاک کا منشا رہے بلکہ اس لئے پہنچو کہ جو بات تم کہنا چاہتے ہو یا جس بات سے لوگوں کو خوش کرنا چاہتے ہو تو اس کی کچھ تائید تمھیں کلامِ پاک سے مل جائے وہ جن کا منصب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے تو کس طریقے سے محض اللہ کی خوشنودی اور اللہ کے خوف کو نظر انداز کر کے لوگوں کی خواہش اور لوگوں کی رضا کے طلبگار ہو جاتے ہیں۔ کنزِ مال کے اندر مشغول ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کنزِ مال اس مال کے جمع کرنے کو ہمیں کیا بتا رہا ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ یہ سونے اور چاندی کے ڈھیر جو انھوں نے جمع کئے ہیں تو اُن کی پرسش سخت ہوگی اور اسی مال سے ان کی پیشانی اور سینے داغے جائیں گے تو ہم نے یہ بات دیکھی اور ہم نے پھر اس سوال پر غور کیا کہ کیا تاریخ محض بنی اسرائیل تک آ کر ختم ہو گئی، کیا اس کے آگے تاریخ نہیں چلی اور کیا یہ محض اساطیر الاوّلین کی صورت ہے جسے ہم سے بیان کیا گیا ہے، کیا یہ نہیں کہ ہم ان قصّوں سے اور ان واقعات سے نصیحت حاصل کریں اور اپنی آنکھیں کھول کے اپنی قوم کی تاریخ کو دیکھیں اس لئے کہ آلِ ابراہیمؑ اور آلِ محمدؐ کا تو دُرود و صلوٰۃ کے اندر ساتھ ساتھ ذکر ہے۔ اگر کلامِ پاک میں آلِ ابراہیمؑ کا ذکر ہے تو کچھ آلِ محمدؐ کا بھی تو ذکر اس کے اندر ہونا چاہیئے تو اس بات کو ہم نے دیکھا اور اس بات سے ہم نے کچھ نصیحت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

ہم نے یہ سوال اٹھایا کہ آخر دین کس کو کہتے ہیں؟ دین کیا ہوتا ہے؟ ہم نے یہ

کوشش کی کچھ غلط فہمیاں جو تھیں دین کے متعلق تو ان کو دُور کیا جائے مثلاً یہ غلط فہمی کہ دین کوئی نظریہ ہے اور جس طرح سے اللہ اکبر ایک نعرہ ہوگیا تو دین جو ہے تو ایک نظریہ ہوگیا مگر ہم نے دیکھا کہ دین نہ کوئی نظام ہے نہ کوئی نظریہ ہے ، نہ دین اس لئے ہے کہ تم اس سے وہ فائدہ حاصل کرو جسے تم فائدہ سمجھتے ہو۔ دین کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرو بلکہ ہمیں یہ بات بتائی گئی ہے کہ فائدہ حقیقت میں وہی ہے کہ جو خود دین کے اندر پوشیدہ ہے ، سیاست اصل میں وہ ہے کہ جو دین ہے نہ کہ اپنی سیاست کے مفاد کی خاطر تم دین کو استعمال کرو ، کچھ غلط فہمیاں جو تھیں تو ان سے ہم نے اپنے دامن کو بچایا اور پھر ہم نے اس کی اور توضیح کی اور پھر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دین تو ایک حقیقت کو تسلیم کرنا ہے کہ جس کو لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں ، توحید جو ہے تو وہ حقیقت ہے۔ پھر دین ایک حکم کی اطاعت کرنا ہے اور ایک صراط کے اوپر چلنا ہے تو یہ تین باتیں جو ہیں ان کے اندر تمام کا تمام دین آجاتا ہے گویا ایک حقیقت کو تسلیم کرنا ، ایک حقیقت کا اقرار کرنا ، ایک حقیقت کی تصدیق کرنا دوسری بات جو ہے تو وہ یہ کہ ایک امر کی اطاعت کرنا ، اور تیسری بات جو ہے تو وہ یہ کہ ایک راستہ کے اوپر چلنا ، صراط ان لوگوں کی کہ جن کے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نازل ہوئیں اس راستے سے دامن بچاتے ہوئے کہ جو اُن لوگوں کا راستہ ہے کہ جن کے اوپر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا ہے یا وہ لوگ کہ جو گمراہ ہو گئے ۔ اور اب مختصراً ایک بات اور سمجھ لو اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اور اس کی تمام چیزوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ان کا قیام عدل کی وجہ سے ہے یہ دو باتیں بس ہمارے سامنے آئیں وہ یہ کہ

حق کے ساتھ پیدا ہوئی ہیں اور عدل کی وجہ سے ان کا قیام ہے اور اس کے بعد ہم یہ بات سمجھ گئے کہ ہمارے ائمہؑ ہمارے ہادی اور ہمارے رہبر وہ کہ جن سے ہماری تمام شفاعت کی امیدیں ہیں ، ان کو جس وقت ہم نے دیکھا تو ہم نے اس وقت یہ بصیرت حاصل کی کہ انکی کوششوں کا مقصد یا تو یہ تھا کہ اس امت کی وحدت کسی طرح سے قائم رہے ۔ امت کا شیرازہ منتشر نہ ہوسکے ، یہ اذان کی آواز جو ہے تو یہ فضا میں گونجتی رہے ، یہ نہ ہو کہ آپس کی لڑائیوں کے اندر یہ اذان کی آواز فضا میں گم ہو کے رہ جائے یا پھر یہ بات تھی کہ جس وقت

ملت اپنے مقصدِ خلق یعنی مرکزِ عدل سے ہٹے تو اس کو عدل کی طرف لوٹایا جائے' اس لیے کہ جس وقت کہ ملت عدل سے ہٹ جاتی ہے تو اس کے اندر فساد پیدا ہوتے ہیں، ظلم پیدا ہوتا ہے ۔عدل کی ضد جو ہے تو وہ ظلم ہے گویا کہ ہمارے دین کا خلاصہ یہ ہوا کہ ایک حق کو تسلیم کرنا، ایک حقیقت کو تسلیم کرنا اور ایک امر کی اطاعت کرنا، ایک حکم کی اطاعت کرنا اور ایک صراط کے اوپر چلنا، یہ ہماری حقیقت ہے، یہ ہماری شریعت ہے، یہ ہماری طریقت ہے، ہماری حقیقت یہ کہئے سوائے اللہ کے اور کوئی اللہ نہیں ہے اور ہماری شریعت یہ ہے کہ اللہ کا رسولؐ جو حکم لے کے آیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے جس امر پر مبعوث کیا ہے اس حکم کی اطاعت کرو بلا چون وچرا اس کی اطاعت کرو، یہ ہماری شریعت ہے اور ہماری طریقت کے معنی یہ ہیں کہ رسولؐ اور رسولؐ نے جن لوگوں کی نشاندہی کی اور جن لوگوں کو بتایا تو اُن لوگوں کے راستے کے اوپر ہم چلتے رہیں، ان کا اتباع کریں وہ اس اطاعت کے اندر آگیا گویا تمام کا تمام جو دین ہے وہ ان باتوں کے اندر آگیا، وہ اس شریعت کے اندر آگیا، وہ اس طریقت کے اندر آگیا، وہ اس امر کے اندر آگیا، وہ اس حق کے اندر آگیا، وہ اس صراط کے اندر آگیا، یہ تمام کی تمام چیزیں دینِ اسلام ہیں حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسے تسلیم کریں، حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسکی اطاعت کریں اور صراط یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس پر رواں ہوں۔

عزیزانِ گرامی! اطاعت اور اتباع میں ایک تھوڑے سے درجے کا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ویسا ہی ہے کہ جس طرح سے عدل اور احسان کے اندر فرق ہے، میں نے آپ سے یہ عرض کیا تھا کہ عدل بنیاد ہے وہ تو آپ کو کرنا ہے، آپ چاہیں یا نہ چاہیں عدل پر کاربند ہونے کے تو آپ پابند ہیں اور جس وقت کہ آپ اس عدل کو کھلے دل کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور رغبت سے تسلیم کرتے ہیں تو اس وقت اور کچھ زیادہ کرتے ہیں تو اس درجہ پر عدل جو ہے تو وہ احسان ہو جاتا ہے جس طریقے سے احسان کی تعریف میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ نماز پڑھنا وہ تو عدل ہے نماز تو آپ کو پڑھنا ہی ہے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر کہ آپ کو یہ فائدہ ہوگا یا آپ کو وہ فائدہ ہوگا، اس لئے کہ فائدے آپ

جانتے ہیں وہ تو ہوں گے ہی اور بہت سارے وہ فائدے جن کو آپ نہیں جانتے وہ بھی آپ کو ہوں گے تو فائدوں کی بات اپنی جگہ ہے لیکن نماز اس یقین سے پڑھیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ یہ باتیں کرنا کہ اس سے روحانی ترقی ہوتی ہے یا پابندیٔ اوقات ہو جاتی ہے، زندگی کے اندر نظم وضبط قائم ہو جاتا ہے، یہ سب باتیں بھی ہیں لیکن یہ نماز کا محرک نہیں ہیں، یہ نماز پڑھنے کا جواز نہیں ہیں، نماز پڑھے جانے کی وجہ تو یہ ہے کہ آپ عبد ہیں اور اللہ تعالیٰ معبود ہے، عبد اور معبود کا رشتہ تو بس عبادت کا ہوتا ہے، جب آپ عبد ہیں اور وہ معبود ہے تو سوائے اس کی عبادت کرنے کے اور آپ کریں گے کیا، اب رہ گئے فائدے وہ تو اللہ تعالیٰ دینے والا ہے اور آپ کیا جانیں کہ کیا کیا فائدے اس سے ہو سکتے ہیں اگر آپ صحیح طور کے اوپر سمجھیں تو آپ کو تو چند فائدے ظاہر کے فائدے نظر آئیں گے اور اللہ تعالیٰ تو نہ جانے کیا کیا فائدے اس کی نگاہ میں ہیں اور کیا کیا فائدے وہ دیگا مگر فائدے کے لئے عبادت نہیں ہوتی ہے، فائدے کے لئے اللہ تعالیٰ کو تسلیم نہیں کیا جاتا، فائدے کے لئے دین اختیار نہیں کیا جاتا خود دین کے اندر بہت سے فائدے ہوتے ہیں، دین تو اس لئے قبول کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہی یہ ہے اور تمام کے تمام راستے جو ہیں تو وہ باطل ہیں، انسانیت کے لئے اللہ نے یہی راستہ مقرر کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے جس کے اوپر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو دین تو اس لئے قبول کیا جاتا ہے، دین کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں یہ نہیں ہوتا کہ آپ کو آزادی ہے کہ تھوڑا سا دین قبول کر لیا اور تھوڑا سا نہیں کیا یہ معاملہ تو ایک عہد (COMMITMENT) کا ایک قلادہ اپنی گردن میں ڈالنے کا ایک عشق پیدا کرنے کا معاملہ ہے یا تو آپ کو عشق ہے یا آپ کو عشق نہیں ہے، اس میں درمیان کی کوئی بات نہیں ہوتی اس طریقے سے یا تو آپ کی گردن میں قلادہ ہے یا نہیں ہے تو عدل تو وہ چیز ہے کہ جس پر آپ کو عمل کرنا ہے اور جس وقت کہ آپ نے اس کو برضا و رغبت کیا تو وہ احسان ہو جاتا ہے چنانچہ احسان کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ نماز

تم اس طریقے سے پڑھو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور خدا کو تو تم دیکھ نہیں سکتے ،
لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے تو اس طریقے سے نماز پڑھو کہ خدا تمھیں
دیکھ رہا ہے اور اگر اس طریقے سے نماز پڑھی تو وہ عدل سے بڑھ کر احسان کے درجے تک پہنچ
گئی تو اسی طریقے سے آپ سب حقوق پورے کر رہے ہیں لوگوں کے جو بھی حقوق آپکے
اوپر عائد ہوتے ہیں تو آپ عدل کر رہے ہیں اس بات کو بھی آپ یاد رکھیں کہ اس
عدل کے اندر سائل و محروم کا ایک حق ہوتا ہے مال کے اندر ، اس کے اندر وہ حق
بھی آ گیا ، اور اگر آپ صدقات کر رہے ہیں ، خیر کے اندر زیادتی کر رہے ہیں اگر آپ بقدر
کفایت بچا کے باقی سب اللہ تعالیٰ کے راستے کے اندر لٹا رہے ہیں تو یہ احسان کی
منزل ہے ، اسی طرح سے ایک درجے کا فرق اطاعت اور اتباع میں بھی ہے ، اطاعت
کے معنی تو یہ ہیں کہ جو حکم آپ کو دیا گیا وہ آپ نے مان لیا اور وہ آپ کو ماننا پڑا اس کی
تو ایسی صورت ہے کہ جیسے اسلامی حکومت سارے عرب کے اندر پھیل گئی بہت سارے
آدمی دین میں بہ اکراہ داخل ہوئے لیکن اطاعت تو ان کو بھی کرنی پڑی اور اتباع کی
منزل جو ہے تو وہ نشانِ قدم کے اوپر چلنا ہے اتباع کسی راستے کا یا کسی رہبر کا ہوا کرتا
ہے تو اچھی طرح سے سمجھ کے اس کی لم تک پہنچ کے آپ جس وقت خوشی سے رضا و رغبت
سے اور تولا کے ساتھ تمام دوسرے راستوں سے اپنے دامن کو بچا کے ان سے بری ہو کے ان
کے اوپر تبرا کر کے جس وقت ایک راستے کے اوپر آپ تولا کرتے ہیں ، ایک راستے
کو آپ پکڑتے ہیں ، ایک صراط کو آپ پکڑتے ہیں تو وہ چیز قرآنی اصطلاح میں اتباع
کہلاتی ہے جس وقت کہ آپ ایک طرف جاتے ہیں اور ایک راستے کے اوپر چلتے ہیں
تو اس کا ایک لازمی پہلو یہ بھی تو ہے کہ آپ کسی اور طرف نہیں جاتے ، ہر طرف سے
منہ موڑتے ہیں اور ایک طرف جاتے ہیں ، آپ ایک نشانِ قدم جو ہے تو اس کا
اتباع کرتے ہیں گویا بالفاظِ دیگر ہم یہ بات کہیں کہ جس وقت اطاعت کے اندر
تولا شروع ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ اطاعت اتباع کے درجے تک پہنچ جاتی ہے
جس طرح عدل کے اندر آپ کی رضا ، آپ کی خوشی جب وہ شریک ہو جاتی ہے تو

وہ احسان کے درجے کے اوپر پہنچ جاتا ہے تو اسی طرح سے اطاعت کے اندر جب تولّا شامل ہوجاتا ہے، جب محبت شامل ہوجاتی ہے، جس وقت کہ آپ اطاعت کر رہے ہیں تو ڈنڈے کے زور سے نہیں بلکہ اس لئے کہ آپ کی طبیعت چاہ رہی ہے جسطرح سے کہ جس وقت کہ آدمی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو سوائے اتباع کرنے کے کچھ کر نہیں سکتا، اس کے سامنے تو بس اس کا محبوب ہوتا ہے کہ جس کو اس نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا، اپنی زندگی کا ماحصل بنایا، اپنی زندگی کا رہبر بنایا، اپنا شفیع بنایا تو جس وقت کہ وہ محبت اور تولّا کے ساتھ اطاعت کرتا ہے تو وہ اطاعت اتباع ہوجاتی ہے۔

اور اب آپ اس بات کو دیکھیں کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے، اگر تم کو اللہ سے محبّت کرنے کا دعویٰ ہے تو تم اتباع کرو اس نبیؐ کا، اس رسولؐ کا تو پھر کیا ہوگا؟ پھر یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا جس طریقے سے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ صلوٰۃ و دُرود تم نبیؐ کے اوپر بھیجو، محمد مصطفےٰؐ کے اوپر بھیجو تو نتیجہ اس کا کیا ہوگا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اللہ اور اس کے ملائکہ تمھارے اوپر دُرود بھیجیں گے، تو یہ درجہ اتباع کا ہوتا ہے، عام طور سے اس کو اسلام اور ایمان کے فرق کے اندر بیان کر دیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت میں اسلام اور ایمان کے فرق میں اور اس سوال کو اٹھانے میں کہ ایمان مقدّم ہے یا اسلام، بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اسلام اپنی جگہ بڑی زبردست حقیقت ہے اور ایمان اپنی جگہ ایک بڑی زبردست حقیقت ہے۔ کلام پاک کے اندر جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں اور کلامِ پاک کے اندر جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کے معانی تو بالکل متعین ہیں لیکن ان کے درجات اور ان کی گہرائیاں لامحدود ہیں تو اب آپ مثلاً اس بات کو دیکھیں اسلام کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو دین اسلام ہی ہے اور یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ جناب ابراہیمؑ اوّل المسلمین تھے اور نام جو رکھا مسلم تو وہ جناب ابراہیم علیہ السّلام نے رکھا، وہ روایت جو ہے تو وہ اسلام کی چلی آرہی ہے، شان یہ دکھائی جارہی ہے کہ صلوٰۃ اور قربانی، مرنا اور

جینا غرض زندگی کے جتنے وظائف ہیں وہ سب اللہ کے لئے ہیں تو گویا اسلام کی ایک شان تو یہ ہے ایک درجہ یہ ہے اور دوسرے موقع پر کلام پاک میں یہ بھی ہے عرب کے بدّو یہ بات کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، تو اُن سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لئے ہو۔ تم یہ بات کہہ سکتے ہو کہ تم نے اسلام کو قبول کیا ہے ورنہ ایمان تو تمھارے قلب تک اترا ہی نہیں ہے۔ یعنی ایک طرف تو وہ اسلام ہے جو جناب ابراہیمؑ کا اسلام ہے، اس کے لئے بھی اسلام کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور دوسری طرف بدوؤں کے لئے بھی قرآن نے یہی اسلام کا لفظ استعمال کیا ہے، اسی طریقے سے یہ بات دیکھو کہ ایمان کی اور مومنین کی جو تعریفیں ہیں تو وہ کلامِ پاک کے اندر پھیلی پڑی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ غالب میں مومنوں کو ہی کروں گا۔ وہ وارثِ زمین بھی ہیں اور وہ دنیا کے اندر غالب ہونے والے بھی ہیں، وہ سب کچھ پاتے ہیں اور یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ، گویا اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان ابھی ناقص ہے تو اس طریقے سے کلامِ پاک نے جو اصطلاح استعمال کی ہے اس کے معنی معین ہیں مگر درجات مختلف ہیں۔ اسلام کے اور ایمان کے لامتناہی درجات ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی حقیقت ہے اس کے ظاہر کو اسلام کہتے ہیں، امر کے تسلیم کرنے کو اطاعت کہتے ہیں اور جو اس کا باطن ہے، جو اس کے قلب سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں اس کو ایمان کہتے ہیں۔ اسلام کے درجات لامتناہی ہیں اور ایمان کے درجات بھی لامتناہی ہیں، بغیر ایمان کے اسلام ایسا ہے جیسے کوئی ظاہر ہو بغیر باطن کے جیسے کوئی جسم ہو بغیر روح کے، مگر وہ اسلام جو اللہ کے نزدیک اسلام ہے اور وہ اسلام جو محمد مصطفےٰؐ کا اور ابراہیمؑ خلیل اللہ کا اسلام ہے تو وہ ظاہر و باطن دونوں کے اوپر محیط ہو جاتا ہے، یہ وہ اسلام ہے جس کے بعد اور کوئی چیز نہیں رہتی تو اس طریقے سے کہ جو الفاظ کا طریقِ استعمال ہوتا ہے اور جس سیاق و سباق (CONTEXT) میں لفظ استعمال ہوتا ہے، اس کو ہمیشہ نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ کلامِ پاک کے الفاظ کا مفہوم صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ تو گویا اس طرح سے اسلام اور ایمان کے درجات

ہوئے تو یہ بات اٹھانا کہ اسلام مقدم ہے یا ایمان مقدم ہے، اسلام برتر ہے یا ایمان برتر ہے، یہ میرے خیال میں غلط فہمی کی بات ہے گویا ہم ایمان کے معنی اور اسلام کے معنی نہیں سمجھتے ورنہ جناب ابراہیمؑ کے اسلام سے اور محمد مصطفیٰؐ کے اسلام سے اور کونسی چیز بلند ہو سکتی ہے، ایمان تو اس کے اندر شامل ہو گیا۔ ہاں ایمان مقدم اس معنی میں ہے کہ پہلا قدم جو ہے تو وہ ایمان کا ہے، اس بات کی میں کچھ اور وضاحت کروں۔

عزیزانِ گرامی! ہوتا اصل میں یہ ہے کہ ایمان ہے اور عمل ہے اکثر جگہ "امنوا و عملوا الصّٰلحٰت" قرآن میں آیا ہے۔ عملِ صالح ہے اس کے بعد علم ہے، یقین ہے تو یہ بہت سارے الفاظ کلامِ پاک کے اندر استعمال کئے گئے ہیں، اور اپنی مخصوص اصطلاحات کے اندر استعمال کئے گئے ہیں، اب ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے، کون مقدم ہے کس طرح سے بات چلتی ہے تھوڑا سا اس کے اوپر ہم غور کریں اس کو آپ یوں سمجھیں میں ایک بہت ہی چھوٹی سی مثال آپ کے سامنے دوں، فرض کیجئے کہ آپ کو کسی جگہ جانا ہے، آپ کو انگلستان جانا ہے یا مکۂ معظمہ جانا ہے، کسی ایسی جگہ جانا ہے کہ جس سے آپ واقف نہیں تو اب پہلا قدم آپ کا کیا ہوگا، جو پہلا قدم آپ اٹھائیں گے تو وہ یہ تو نہیں ہوگا کہ کبھی شمال کی طرف گئے، کبھی جنوب کی طرف گئے، کبھی مشرق کو گئے، کبھی مغرب کو گئے اور اس طرح بغیر کسی سمت کا تعین کئے آپ یہ امید کرتے رہیں کہ آپ منزل پر ٹھیک ٹھیک پہنچ جائیں گے یہ بات ممکن نہیں ہے۔ کوئی اس طرح کا اقدام نہیں کرے گا بلکہ آپ یہ کریں گے کہ کسی آدمی کے متعلق جس کو آپ یہ جانتے ہوں گے کہ یہ انگلستان ہو آیا ہے تو آپ اس کے پاس جائیں گے یا کسی کتاب کو آپ ٹٹولیں گے لیکن وہ کتاب معتبر ہونی چاہیئے، وہ کتاب جس سے منسوب ہو وہ معتبر ہونا چاہیئے گویا آپ یا تو کسی معتبر کتاب کو دیکھیں گے یا کسی شخص کو دیکھیں گے، ان باتوں کے علاوہ آپ اور کچھ نہیں کر سکتے، گویا آپ کسی ایسے شخص سے جو اس منزل سے واقف ہو جس تک آپ کو پہنچنا ہے یہ پوچھیں گے کہ ہمیں وہاں جانا ہے، آپ چونکہ اس راستے کے اوپر جا چکے ہیں آپ اس کی تمام منازل سے واقف ہیں تو آپ ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ گویا منزل تک پہنچنے کا وسیلہ کوئی شخص ہوگا یا کوئی کتاب، اور وہ کتاب بھی کسی شخص کی نسبت ہی سے معتبر ہوگی۔

اس طرح بات گھٹ کر کسی شخص تک رہ جاتی ہے۔ جب آپ کسی شخص کے اندر ایمان رکھتے ہیں تو یہ درجہ ایمان کا ہوتا ہے، اس بات کو آپ یاد رکھیں کہ ایمان ہمیشہ غیب کا ہوتا ہے۔ جس چیز کا آپ کو علم نہیں ہے اس کا ایمان ہوتا ہے۔ جس وقت علم ہو جاتا ہے تو وہ یقین کا درجہ ہوتا ہے، تو ایمان ہمیشہ ایمان بالغیب ہوتا ہے، عزیزو! ایک موٹی سے بات میں آپکو بتاؤں، ایمان جاننے کو تو نہیں کہتے ایمان تو ماننے کو کہتے ہیں، ایمان کے تو معنی ہی ماننے کے ہیں، ایمان کے معنی تو جاننے کے کسی جگہ بھی نہیں ہیں، میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ شخص کی اہمیت جو ہمارے عقیدے میں ہے کتاب کے ساتھ حاملِ کتاب کی جو اہمیت ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ ایمان کا مرکز شخص ہی ہوتا ہے، ایمان کی ابتدا بھی شخص سے ہوتی ہے اور انتہا بھی شخص ہی پر ہوتی ہے۔ جتنی بات ہے وہ شخص کے چاروں طرف چلتی ہے، کتاب جو معتبر ہوتی ہے تو وہ بھی شخص کی وجہ سے، وہ شخص کہ جو حاملِ کتاب ہے اگر وہ معتبر نہیں ہے تو وہ کتاب بھی معتبر نہیں ہے، تو یہ درجہ ایمان کا ہے۔ اب آپ جب کسی شخص پر ایمان لے آئے تو اس نے آپکو بتایا کہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے، کس ذریعہ سے سفر کرنا ہے، کیا زادِ راہ ساتھ لینا ہے، اس کا حکم مانتے جائیں گے، اس کے کہنے پر عمل کریں گے۔ یہ دوسرا درجہ ہے۔ ایمان کے بعد عملِ صالح کی منزل ہے۔ عملِ صالح کا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی پر آپ نے اعتبار کیا ہے اس کے کہنے پر چلیں، اس کے حکم کی اطاعت کریں۔ اور پھر وہی بات کہ آپ نے اس طرح عمل نہیں کیا کہ شمال کو گئے، جنوب کو گئے، اِدھر اُدھر سفر کرتے رہے، پہلے علم حاصل کیا، بلکہ جب آپ اپنی منزل تک پہنچ گئے تب علم حاصل ہوا، گویا علم جو ہے تو وہ عمل کے بعد حاصل ہوتا ہے اور عمل سے پہلے اس علم کو حاصل کرنے کی کوشش کرو تو وہ محض بے معنی بحثیں ہوتی ہیں، وہ محض اس قسم کی بحثیں ہوتی ہیں جو کسی جگہ لے جانے والی نہیں، وہ علم کہ جو عمل سے پہلے حاصل ہوتا ہے نامعتبر ہے، محض سنی سنائی بات ہے، اور وہ علم جو عمل کے بعد حاصل ہوتا ہے وہی حقیقی معنوں میں علم ہے، جناب امیرالمومنینؑ نے علم کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک علمِ مسنون اور ایک علم مذبور، ایک تو وہ علم کہ جو سنی سنائی باتوں سے حاصل ہوتا ہے اور

ایک وہ علم کہ جو آپ کی فطرت کا حصّہ بن گیا ہے، وہ علم کہ جو تجربہ بن گیا ہے وہ علم ایسا نہیں ہوتا کہ جس کے متعلق کلامِ پاک کے اندر یہودی علماء کے متعلق یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کی حالت تو یہ ہے کہ جیسے گدھے کے اوپر بہت ساری کتابیں لدی ہوئی ہیں، یعنی کلامِ پاک کے اندر ایک تمثیل دی گئی یہودی عالم کی، اب یہودی ہی کی تخصیص کیوں کرو، ایک قسم ہوتی ہے عالموں کی اور وہ ہر قوم کے اندر ہوتے ہیں، یہ اپنی طبیعت کو خوش کرلینا کہ یہ تمثیل تو بس یہودی عالموں کی ہے۔ ہم تو اس سے بری ہیں، تو عزیزو! یہ بات نہیں کلامِ پاک کا طریقہ یہ ہے کہ کسی آیت کا ایک موقع محل ہوتا ہے، ایک شانِ نزول ہوتی ہے، کسی آدمی یا واقعے کے اوپر وہ آیت نازل ہوتی ہے لیکن اس کا مفہوم آفاقی (UNIVERSAL) ہوتا ہے وہ عالمگیر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کلامِ پاک اس لئے نہیں نازل ہوا کہ کچھ واقعات بیان کئے جائیں، کچھ آدمیوں کا ذکر کیا جائے بلکہ ان آدمیوں اور واقعات کے ذریعے سے آفاقی اور عالمگیر حقیقتوں کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ خرابی ہم لوگوں کے اندر بھی آگئی ہے اور وہ یہ ہے کہ جیسے مومنوں کی تعریف میں، مومنوں کی شان بیان کرنے کے لئے کوئی آیت آئی اور ہم نے یہ بات کہی کہ جنابِ امیرالمومنینؑ کی شان میں آئی ہے، بیشک نزول کا موقع وہی تھا لیکن کوئی نہ کوئی مصلحت تو ہے جو ایک آدمی کا نام لے کے اللہ تعالیٰ نہیں کہتا بلکہ مومنوں کی تعریف میں کہتا ہے تو اب یہ تو نہ کرو کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے لئے آئی ہے ہمیں اس آیت سے کیا تعلق، اللہ تعالیٰ تو یہ کہتا ہے کہ ایمان کی نشانیاں یہ ہیں، اور اگر تم ایمان کو مجسم صورت میں دیکھنا چاہتے ہو تو حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو دیکھ لو لیکن اگر تم یہ کہہ کر آنکھیں بند کرلو کہ یہ آیت تو حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے لئے آئی ہے اور ہمیں تو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے تو یہ بات گمراہی میں ڈالنے والی بات ہے، تو علم جسے کہتے ہیں اس کی وہ شان نہیں ہے کہ جس کے متعلق کلامِ پاک میں کہا گیا ہے کہ یہودی عالم تو ایسے ہوتے ہیں کہ جیسے گدھے کے اوپر کتابیں لدی ہوں، نہیں اب یہ علم تجربہ بن گیا، اب یہ علم نور بن گیا، اس لئے کہ آپ نے اس کا تجربہ کیا، آپ نے اس کو دیکھا ہے، آپ نے اس کو پرکھا ہے

وہ آپ کی زندگی، آپ کی تجرباتی زندگی کا ایک حصہ بن گیا تو اب تم یہ دیکھ لو کہ علم جو ہے تو اس کو تم کون سی منزل دیتے ہو، کیا وہ علم ایسے پتھر ہیں کہ جن کو تم لادے ہوئے ہو، جو تمھیں ڈبو چھوڑیں گے یا علم وہ نور ہے جو تمھارے آگے آگے چلتا ہے، تمھیں راستہ بتاتا ہے ، اس لئے کہ علم یا تو پتھر ہے یا علم نور ہے۔

عزیزانِ گرامی! عمل کے بعد علم کی جو منزل آتی ہے تو وہ نور کی منزل آتی ہے۔ جب علم نور بن جاتا ہے تو پھر دین کے اصول بھی سمجھ میں آجاتے ہیں، پھر توحید جو ہے تو وہ بھی آپ کی سمجھ میں آجائے گی، رسالت بھی، امامت بھی، عدل بھی، سب سمجھ میں آجائیگا یہاں تک کہ قیامت بھی سمجھ میں آجائے گی۔ جلال الدین رومی نے کہا ہے کہ ؎

پس قیامت شو قیامت راز ہیں

دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

کہ ہر چیز کو دیکھنے کی شرط یہ ہے کہ ہر چیز سے اپنے آپ کو IDENTIFY کردو، قیامت تمھارے اندر پیدا ہوگی تو تم قیامت کا مطلب سمجھ جاؤ گے، لیکن وہ عمل کے بعد والی بات، عمل کے بعد جو ہے تو وہ علم ہوتا ہے اور پھر اس علم کے درجات ہوتے چلے جاتے ہیں علم الیقین ہوتا ہے، عین الیقین ہوتا ہے۔ جس طرح ایک آدمی ایک بات آنکھوں سے دیکھ رہا ہو وہ عین الیقین ہوتا ہے۔ اس ایمان اور یقین کا فرق، دیکھو جناب ابراہیمؑ علیہ السلام یہ فرماتے ہیں، یا اللہ مجھے تو یہ دکھا دے کہ مردے زندہ کیسے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ابراہیمؑ کیا تمھیں ایمان نہیں ہے۔ یہ تو ایک پیغمبرؐ سے اور خدا سے براہِ راست باتیں ہو رہی ہیں، کہا جا رہا ہے کہ کیا تمھیں اس بات کا ایمان نہیں ہے جناب ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ یا اللہ ایمان تو مجھے ہے، لیکن میں اطمینانِ قلب کے لئے پوچھ رہا ہوں ایمان کے درجے سے بڑھ کر عین الیقین کے درجے پر پہنچنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ عین الیقین کے درجے کے اوپر قلب کا اطمینان پیدا ہوتا ہے تو اس طرح سے ایمان و یقین ایک چیز نہیں، یقین ایمان کے بعد آتا ہے، ایمان ابتداء ہے، اس بات سے یہ مت سمجھو کہ ایمان پہلی منزل کے اوپر ختم ہوگیا، بلکہ تمام کی تمام منزلوں میں ایمان کے اندر

گہرائی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، ایمان مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے، کوئی منزل ایسی نہیں ہوتی کہ جس میں پچھلی بات ختم ہو جائے بلکہ جیسے جیسے منزل آگے بڑھتی ہے تو وہ تمام پچھلی منزلوں کو لے کر آگے بڑھتی ہے، ایمان جو ہے تو وہ چلتا چلا جاتا ہے، ایک منزل علم الیقین ہو جاتی ہے، پھر حق الیقین ہو جاتی ہے، پھر عین الیقین ہو جاتی ہے اور یہ وہ منزل ہوتی ہے جب آدمی کسی حقیقت سے بالکل (IDENTIFY) متعارف ہو جاتا ہے۔

تو اس طریقے سے یہ منزل چلتی ہے، دینِ اسلام ایک صراط کے اوپر چلتا ہے صراط پر چلنے کے لئے ایک ہادی کو آپ نے مانا، ہادی نے جن ہادیوں کو بتایا تو ان کو آپ نے مانا، ان کو ماننے کے بعد آپ نے ان کے حکم کا اتباع کیا، اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ جیسے احسان بغیر عدل کے کچھ نہیں ہوتا، جیسے درخت بغیر جڑ کے بیکار ہے اسی طرح سے اتباع بغیر اطاعت کے کچھ نہیں ہے، یہ بات کہتے چلے جائیں کہ ہم اتباع کرتے ہیں، ہمیں تولا ہے اور اطاعت نہ کریں جو پہلی منزل ہے تو وہ اتباع جو ہے وہ محض ایک لفظ ہے جس کے کوئی معنی نہیں ہیں وہ محض ایک آواز ہے جو بے مقصد ہے تو اس طریقے سے ہادی کا حکم مانا تو راستہ کا علم حاصل ہونا شروع ہو گیا اور علم کے بعد یقین کے مدارج آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان درجات کے متعلق ارشاد فرمایا کہ دیکھو پہلا درجہ جو ہے تو وہ زبان سے اقرار کرنے کا ہے، زبان سے اقرار کر لیا آپ سلامتی کے اندر آ گئے، آپ کی جان و مال محفوظ ہو گئے، دوسرا درجہ اس وقت آتا ہے جس وقت کہ آپ کے قلب نے تصدیق کی، اس بات کی جو آپ نے زبان سے کہی، میں ان درجوں کی گہرائیوں میں نہیں جاتا کیونکہ ایک ایک بات کافی تفصیل طلب ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ آپ نے جتنے دین کے اصول ہیں ان کو اچھی طرح سمجھا لیکن آپ کا عمل ناکمل رہا۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ جب آپ تمام اصولوں کو سمجھتے ہیں اور عمل بھی آپ کا صحیح رہتا ہے بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں اور اس کے بعد درجہ وہ ہوا جس کے بعد آپ نے تمام اصول بھی اچھی طرح سے سمجھ لئے ان کے اوپر ایمان بھی ہو گیا، عمل جو ہے تو وہ عملِ صالح بھی ہو گیا اور پھر آپ کو وہ علم حاصل ہوا کہ جس سے آپ کا

ضمیر نورانی ہوگیا، وہ علم جو ہے وہ آپ کے تجربے سے پیدا ہو رہا ہے، وہ آپ کی زندگی کا ایک حصہ ہے، اور پھر آخر میں آپ فرماتے ہیں کہ آپ ایمان لائے، ایمان کے بعد آپ نے عمل کیا پھر آپ کو یقین حاصل ہوگیا اور یقین کے بہت سے درجات حاصل ہوگئے، اب یقین کے جو درجات امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمائے تو ان کو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، یقین کیا ہے وہ آپ نے فرمایا یقین توکل ہے اور عزیزانِ گرامی! ذرا سی گفتگو توکل کے متعلق کرلی جائے، یہ بات نہیں ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، اس صورت میں کہ ایمان بھی نہیں ہے، اطاعت بھی نہیں ہے، علم بھی نہیں ہے، یقین بھی نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کو توکل نہیں کہتے۔ امامؑ فرماتے ہیں کہ یقین میں پہلی چیز توکل ہے، وہ اس وجہ سے کہ اب اس آدمی کو حق الیقین تک یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ اسباب کچھ نہیں ہیں مسبب الاسباب سب کچھ ہے۔ اب اس نے چلتے ہوئے قلم کو نہیں دیکھا بلکہ اس ہاتھ کو بھی دیکھا کہ جو اس قلم کو چلا رہا ہے، اب اس نے سبب کی سطح سے بلند ہو کر مسبب الاسباب کو بھی دیکھ لیا تو گویا پہلی چیز جو ہے وہ توکل ہے۔ اب یقین کس کو کہتے ہیں، یقین کہتے ہیں توکل کو، یقین کہتے ہیں تسلیم کو، تسلیم کے معنی یہ ہوئے کہ جس راستے پر آپ چل رہے ہیں جو کچھ بھی تقدیرِ الٰہی ہے اسے مانا جائے۔ یعنی وہ تقدیر یا وہ بات جو اس کی مرضی و منشار کے خلاف ہے جس سے اس کا ارادہ ٹوٹ گیا، عزائم فسخ ہوگئے ہیں تو اگر کوئی اس تقدیر کے اوپر راضی ہوجائے تو وہ ایمان کے بہت بلند درجے کے اوپر فائز ہے یہ گویا تسلیم ہوئی کہ جو کچھ آپ کے اوپر گذرا ہے، جو کچھ واقع ہو رہا ہے، آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس میں بڑی اچھی اور بڑی نیکی کی راہ کھول دیتا ہے تو یہ بات تسلیم کی ہوئی اور تیسری بات رضا کی ہے کہ جو شخص یقین کے درجہ کے اوپر فائز ہوتا ہے تو اس کے پیشِ نظر سوائے رضائے الٰہی کے اور کچھ نہیں ہوتا یعنی اب وہ مشیت امر و رضا کا فرق جو ہے تو وہ اچھی طرح آپ پر ظاہر ہوگیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت میں حصہ دار نہیں بنایا ہے اور آپ کو جو حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ تلاش کرو تو میری رضا کو تلاش کرو اور اس چیز کو تلاش کرو جس سے میں خوش ہوتا ہوں لٰلہ

تعالیٰ نے اپنی مشیّت تو نہیں بتائی مگر یہ بالکل واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کن چیزوں سے خوش ہوتا ہے اور کن چیزوں سے ناراض ہوتا ہے، اب یہ کہ وہ ناراض ہونے کے باوجود ہمیں کھانے پینے کو دیتا ہے، یہ دوسری بات ہے، یہ اس کی شانِ بے نیازی ہے تو گویا تیسری منزل جو یقین کی ہے تو وہ رضا ہے اور چوتھی چیز جو یقین کی ہے وہ امامؑ فرماتے ہیں تفویض الی اللہ کہ اپنے نفس کو اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے، اب اس کی کوئی چیز اپنی چیز نہیں ہے، نہ ہاتھ نہ پاؤں نہ سر نہ آنکھیں، سب کچھ اللہ کا ہو چکا اور اب انسان ولی اللہ بنتا ہے، ید اللہ بنتا ہے، اذن اللہ بنتا ہے، عین اللہ بنتا ہے، یہ منزلِ ید اللہ بننے کی ہے تو اس طریقے سے یہ صراط کہ جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں تو یہ قائم ہوئی اس کے اوپر چلنے والے رہبر مقرر ہوئے، اس صراط پر چلنے کو تولّی کہتے ہیں، اس صراط کے ہادیوں اور رہبروں سے محبت تولّا ہے۔ محبت کے تقاضے ہر ایک سے یکساں نہیں ہوا کرتے، تین بڑی طاقتیں آدمی کے اندر ہیں، ادراک ہے، احساس ہے اور ارادہ، ادراک آدمی کو حقیقت کی طرف لے جاتا ہے اور احساس کسی محبت کی وجہ پیدا کرتا ہے اور ارادہ جو ہے تو اس کا تعلق عمل سے ہوا کرتا ہے۔

عزیزانِ گرامی! اگر احساس کو نکال رہے ہو، اس محبت کو تم نکال رہے تو تم دیکھو کہ اسلام ایک بے جان چیز بن گیا ہے، تمھاری عقل بھی تسلیم کر رہی ہے اور ارادہ بھی یہی کہہ رہا ہے کہ محبت اور احساس کا جذبہ اس میں شامل ہونا چاہیئے تو اس طرح سے تینوں کی تینوں چیزیں ضروری ہیں جس وقت کہ ان تینوں چیزوں میں ہم آہنگی ہو جاتی ہے یعنی انسان کا ادراک، انسان کا احساس اور انسان کا ارادہ یہ سب ہم آہنگ ہو گئے تو عزیزانِ گرامی! پھر جس چیز کو کہ صفوۃ اللہ کہتے ہیں تو وہ حاصل ہوتی ہے۔ محض ایک بات میں آپ سے عرض کروں اور وہ یہ ہے کہ عزیزو! تولّا وہ کیا ہوا جس کے اندر کوئی امنگ نہ پیدا ہو جس کے اندر کوئی امنگ نہ نہ پیدا ہو جس کے اندر کوئی روح نہ پیدا ہو وہ تولّا کیا ہوا، سعدی نے کچھ شعر لکھے ہیں کہ ؎

گلے خوشبوئے در حمّام روزے رسید از دست محبوبِ بدستم

کہ ایک مٹی کا ڈلا تھا بہت خوشبودار تو میرے ایک دوست نے وہ مجھے حمام میں دیا وہ مٹی کا ڈلا میرے ہاتھ تک پہنچا اب یہ اس مٹی کے ڈلے کو دیکھ رہے ہیں سعدی یہ کہہ رہے ہیں ۔

بدو گفتم کہ مشکیں را زیں از بوئے دل آویزے مستم

کہ میں اس مٹی کے ڈلے سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ تو کیا چیز ہے ، میں تو تیری خوشبو سے مست ہوا جا رہا ہوں ، مٹی کی ڈلی جواب دیتی ہے ۔

گفتت من گِل ناچیز بودم

وہ مٹی کی ڈلی کہتی ہے کہ میں مٹی کی ایک ڈلی تھی ناچیز ڈلی تھی ۔

ولیکن مدتے با گُل نشستم

لیکن ایک عرصہ ایسا ہوا کہ مجھے گُل کی صحبت حاصل ہو گئی ۔

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد وگر نہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

ہم نشیں کا جمال تھا کہ جس نے مجھ پر اثر کیا ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں کہ جو کہ ہوتی ہے ، یہ صفوت اللہ یہ رنگ ، یہ خوشبو حاصل کرنا ، یہ تولا کی نشانی ہے جب تک کہ وہ رنگ پیدا نہیں ہوتا ، جب تک کہ وہ خوشبو پیدا نہیں ہوتی تو اس وقت تک تولا نہیں ہوا کرتا ۔ تولا کو دیکھنا ہے تو اس کو عمل کے اندر دیکھیں ، اعتقاد کے اندر دیکھیں اور پھر رنگ کے اندر دیکھیں اور بو کے اندر دیکھیں اور یہ بات کہ ہمارے ائمہؑ ہماری مغفرت کرنے والے ہیں تو اس مغفرت کی کھی میں آپ کو بات بتا دوں یہ وہ بات نہیں ہے جیسا کہ دینِ مسیح کے اندر یہ تخیل ہے کہ سب لوگوں کے گناہ لے کے ایک آدمی نے اپنی قربانی دے دی اور اس کے نتیجہ میں سب کو نجات ہو گئی ، سب کے گناہ معاف ہو گئے ۔ دینِ اسلام میں بنیادی بات یہ ہے کہ ہر آدمی اپنا بوجھ خود اٹھائے گا ، یہ اپنی انفرادی ذمہ داری دینِ اسلام کی بنیاد ہے ۔ شفاعت کے معنی یہ نہیں ہوا کرتے کہ ہم اپنی ذمہ داری پوری نہ کریں اور ہاں تم نے یہ کبھی دیکھا کہ شفاعت وہ کرتے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے یعنی

اللہ تعالیٰ کے حکم سے باہر کوئی چیز نہیں۔ اور وہ شفاعت اس وقت ہوتی ہے کہ جب صحیح راستے کے اوپر تو آپ چل رہے ہوں یعنی سمت تو آپ کی ٹھیک ہو، راستے کے اوپر چلے اور گر پڑے تو اللہ کی مرضی ہوگی تو پھر آپ کو اٹھائے گا، اُس نے آنکھوں کو رہبر بنا دیا تو آنکھ سے لغزش ہوئی، ہاتھ سے لغزش ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ بڑا مغفرت کرنے والا ہے وہ آپ کو معاف کرے گا لیکن ہاں جب آپ کی سمت ہی ٹھیک نہیں ہے تو پھر وہ کیا ہدایت کرے گا۔ جب آپ کی سمت ٹھیک نہیں ہے تو پھر مدد کیسی، مغفرت ان کے لئے ہے جن کی سمت ٹھیک ہے، جو قبلہ کی طرف منہ کئے ہوئے ہیں، مگر جو قبلہ سے منہ پھیرے ہوئے ہیں ان کی مغفرت نہیں ہے، ان کے لئے کلام پاک میں ہے کہ اے محمدؐ ان کے لئے ستر دفعہ بھی استغفار کرو تو ان کی مغفرت نہیں ہونے کی، تو اس بات کو سمجھ لو محمدؐ و آلِ محمدؐ سے جو مغفرت کے امیدوار ہیں تو یہ بھی دیکھ لیا کریں کہ انکی سمت ٹھیک ہے یا نہیں، سمت ٹھیک کر لو اس کے بعد لغزشیں ہوتی ہیں، اس کے بعد آدمی گرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے پھر گرتا ہے پھر اٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ انسان کی فطرت کیسی ہے اور کبھی کبھی تو وہ اس توبہ کرنے کو اور گرنے کو اور زیادہ بخشش کا وسیلہ بنا دیتا ہے بلکہ یہ بات کہی جاتی ہے کہ اللہ کی بخششیں اسی وقت ہوتی ہیں کہ جب آدمی توبہ کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر ایسا نہیں ہے جو کثرت سے استغفار نہ کرتا ہو اس لئے کہ اللہ کی بخششوں کی یہی صورت ہوتی ہے تو اپنی سمت کو ٹھیک رکھو، پھر اپنے لئے شفاعت اور مغفرت کی امید رکھو۔

آخر کلام کے طور پر میں امام جعفر صادق علیہ السّلام کا ایک قول پیش کر رہا ہوں جس میں آپ نے یہ بتایا ہے کہ ہمارا شیعہ کس کو کہتے ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تو یہ دعویٰ کرتے پھریں کہ وہ ہمارے امام ہیں اور ادھر سے یہ کہا جائے لست منّی تم ہمارے نہیں ہو۔ تو یہ بات نظر میں رکھنی چاہیئے کہ ہم جنھیں اپنا امام کہتے ہیں، ہم جن کی محبّت کے دعویدار ہیں تو ان کی نظر میں اپنے ماننے والوں کی کیا شناخت ہے تو جناب امامؑ فرماتے ہیں کہ اے لوگو! ہمارے لئے باعثِ زینت بنو۔ پہلا

پہلا فقرہ یہ ہے لوگو ہمارے لئے باعثِ زینت بنو باعث ننگ و عار مت بنو۔
عزیز و سوچے جاؤ اس جملے کو اور اس بات پر غور کئے جاؤ کہ کہیں تمھارے عمل اور تمھاری باتیں ایسی تو نہیں کہ امام جن کو دیکھ کر شرمائے کہ یہ میرے ماننے والے ہیں اور ان کا یہ عمل ہے تو پہلا ہی پہلا فقرہ یہ ہے کہ اے لوگو تم ہمارے لئے باعثِ زینت بنو باعثِ ننگ و عار مت بنو اور دیکھو لوگوں سے اچھا برتاؤ رکھو یہ بات مت کرو کہ تم نے ایک گروہ بنا لیا اور کہا کہ ہم تو ایک الگ گروہ ہیں اور دوسرے گروہوں سے لڑیں گے، یہ بات مت کرو، لوگوں سے اچھا برتاؤ کرو۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ اپنی زبان کو (عزیزو! یہ زبان، ہاتھ پیر بڑی چیزیں ہیں یہی گواہی دینے والے ہیں) اپنی زبانوں کو فضول باتوں سے محفوظ رکھو۔ اور امامؑ فرماتے ہیں ہمارے ماننے والے ہمارے شیعہ ہماری جماعت کے آدمی وہ نہیں ہیں کہ جو فضول باتیں کرتے پھریں، جو لوگوں کو خوش کرنے کے لئے واہی تباہی باتیں کرتے پھریں، جو فضول باتیں ہیں ان سے اپنی زبان کو محفوظ رکھو، یہ زبان ذکرِ الٰہی کرتی ہے اس کو پاک صاف رکھو، جو لہو و لعب کی باتیں ہیں ان سے محفوظ رکھو اور امامؑ فرماتے ہیں دیکھو تو ہمارے شیعہ جو ہیں، جو ہمارے ماننے والے ہیں، جو ہم سے نزدیک ہیں ہماری معیت کا شرف جن کو حاصل ہے تو وہ لوگ جو اربابِ وفا ہیں، جو انھوں نے عہد کیا ہے اس کو نبھاتے ہیں، عہد اللہ سے ہوا۔ عہد رسولؐ سے ہوا، اور اس عہد کو مزید توثیر دی گئی اور مضبوط کیا گیا، امامؑ کے ہاتھ پر بیعت کر کے تو اس عہد کو باقی رکھنا ہے، اس سے مخلص (LOYAL) رہنا ہے اپنے اللہ، اپنے رسولؐ اور اپنے امامؑ سے جو عہد ہے اس کو وفا کرنا ہے، اور پھر آپؑ نے فرمایا کہ ہمارے شیعہ امانت دار ہیں، یہ بات سمجھ لو کہ اگر تم ہمارا نام لیتے ہو ہمارے گروہ کے اندر ہو تو تم ایک بڑی زبردست امانت کے وارث ہو اور وہ امانت جو ہے وہ پیغمبروں کی امانت ہے اور وہ تمام صادقین کی امانت ہے، وہ صالحین اور شہدار کی امانت ہے اس کے تم امانت دار ہو، دیکھنا کہیں تم یہ مت ہونے دینا کہ امانت میں خیانت ہونے لگے، اس امانت کی

حفاظت کرو اور جناب امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ ہمارے شیعہ کوشش کرنے والے جد وجہد کرنے والے ہیں۔ سعی کرنے والے ہیں تو وہ یہ بات نہیں کرتے، جناب موسیٰؑ کے ماننے والوں کی طرح کہ جو اُن سے یہ کہتے تھے کہ موسیٰؑ تم خود ہی چلے جاؤ۔ وہ امامؑ سے یہ نہیں کہتے کہ اے امامؑ تم خود ہی چلے جاؤ اس راستے پر، ہم یہاں تمھارا نام جپیں گے بلکہ جب ان کو راستہ دکھایا جاتا ہے تو اس راستے پر کوشش اور جدوجہد کے ساتھ چلتے ہیں اور آگے بڑھنے والے ہیں اور فرمایا کہ وہ اہلِ تقویٰ ہیں جن چیزوں سے منع کر دیا گیا ہے ان سے وہ پرہیز کرنے والے ہیں اور پھر آپؑ فرماتے ہیں اور ایک مثال دیتے ہیں کہ ہمارے ماننے والے مضبوط قلعے کی طرح ہیں ان کے سینے امانت کو محفوظ رکھتے ہیں۔ انکی عقل وزن دار ہے اور وہ پیٹ کے ہلکے نہیں ہیں، وہ چھچھورے پن کی باتیں نہیں کیا کرتے اس طرح سے وہ ایک مضبوط قلعہ ہیں اور وہ اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ وہ شجاع ہیں اور باہمت ہیں تو امام جعفر صادقؑ نے یہ باتیں جو بتا دیں، عزیزو! یہی مومن کی شناخت ہے اور یہی شیعوں کی شناخت ہے اور یہی ہماری پہچان ہے، اور امامؑ عالی مقام کے اسی کلام کے اوپر میں اپنے سلسلۂ تقاریر کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمھارے سب کے عمل کو قبول فرمائے۔

(تصدیق نامہ)   ۸ر نومبر ۱۹۷۹ء

۷۸۶

ذکر حسینؑ نامی کتاب مصنفہ پروفیسر کرار حسین صاحب
سابق وائس چانسلر کے صفحات میں درج شدہ عربی آیات
و احادیث میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

حافظ محمد یٰسین سند یافتہ

امام نایاب جامع مسجد
ڈاکخانہ ا لیاقت آباد کراچی

خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر